خوابوں کی گرہ میں پڑی لڑکی

غافر شہزاد

گورا پبلشرز ○ ۲۵ لوئر مال لاہور

خوابوں کی گرہ میں پڑی لڑکی

غافر شہزاد

گورا پبلشرز ○ ۲۵ لوئر مال لاہور

ناشر :
طاہر اسلم گورا

بار اوّل : ۱۹۹۵ء
زاہد بشیر پرنٹرز۔ لاہور
سرورق : امجد رفیق
قیمت : ۷۰ روپے

انتساب!

خوابوں کی گرہ میں

پڑی ہوئی

ایک لڑکی کے نام

ترتیب

خواب خراج

خواب خزاں

○ مستنصر حسین تارڑ-----

ہماری نسل شائد خوش قسمت تھی۔

ہم میں سے کچھ ایسے ہیں، جن کے لاشعور میں کہیں آج بھی روم جل رہا ہے، لاہور جل رہا ہے۔ ایک دھندلی سی یاد ملک کی تقسیم کی اور بہنے والے لہو کی، لیکن جو تصویر ابھی دھندلی نہیں ہوئی وہ مارشل لاز کی ہے۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کی شکست کی ہے جسے ہم "سقوطِ ڈھاکہ" ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، "یا غروبِ مشرقی پاکستان" کے شوگر کوٹڈ لفظوں میں بیان کرتے ہیں ہم میں نہ ہمت ہے کہ اسے شکست کہیں اور نہ جرأت ہے۔ جرأت ہوتی تو شکست نہ ہوتی۔

چنانچہ ہماری نسل شائد خوش قسمت تھی اور ہے کہ ہمیں ایسے واقعات اور سانحات میں سے گزرنے کا موقع ملا جو صدیوں کے بعد ظہور پذیر ہوتے ہیں (یا ہونے چاہیں) ان کی اثرانگیزی ہم پر ایسی تھی کہ ہم از حد ناخوش ہوئے، ہمارے اندر ایک گہری خاموشی، ضبط اور غصہ تھا جسے ہم نے تحریروں میں ڈھالنے کی کوشش

کی۔ چونکہ واقعات بڑے تھے اس لیے ہم میں سے بہت ساروں نے (میرے علاوہ) بڑا ادب تخلیق کیا.......... چنانچہ یہ خوش قسمتی تھی۔

لیکن غافر شہزاد کی نسل اتنی خوش قسمت نہیں انہیں تاریخی واقعات نہیں ملے ان کا آفٹر افیکٹ ملا ہے، ان کے سامنے زوال کی ایک ایسی فلم چل رہی ہے جس کا انجام سب جانتے ہیں۔ پردہ سکرین پر فلم اپنے منطقی انجام تک پہنچ رہی ہے۔ اور تماشائی چپ بیٹھے دیکھتے چلے جا رہے ہیں۔ کیا یہ تمام تماشائی سازش میں شریک ہیں...... شاید ایسا ہے۔ صرف غافر ایسے لکھنے والے سازش میں شریک نہیں اور وہ آواز بلند کرتے ہیں، ان کی آواز سنائی نہیں دیتی، کیونکہ فلم کا ساؤنڈ ٹریک جان بوجھ کر اتنا بلند رکھا گیا ہے کہ ہال میں سے اُٹھنے والی چند آوازیں اس کے شور میں مکمل طور پر دب جاتی ہیں۔

ایسی صورتِ حال میں ہی آواز بلند کرنا ہمت ہے اور جرأت ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ غافر کی آواز بلند ساؤنڈ ٹریک پر حاوی ہو جائے گی کیونکہ اس میں سچائی اور.......... سچائی ہے۔

۱۹، دسمبر ۱۹۹۴ء

○ مسعود اشعر -----

غافر شہزاد کے افسانے ایک ایسے نوجوان کا حسیاتی گوشوارہ بناتے ہیں۔ جو ہر شے اور ہر واقعہ کو جذبات کی کسوٹی پر کس کر دیکھتا ہے لیکن یہ جذبات فکر سے یکسر عاری بھی نہیں ہیں۔ ہر نوجوان کی طرح ان کے ہاں بھی جذبات اور فکر کی کشمکش ہر سطح پر موجود رہتی ہے وہ بلی کی آنکھیں ہوں، یا گرین ہاؤس اثر یا گھر کی دہلیز تک پہنچ جانے والی جنگ، یہی کشمکش ان کے افسانوں کا تانا بانا بناتی ہے۔ ان کے افسانوں میں اپنے آپ کو، اپنے ماحول کو اور اپنے عہد کو پہچاننے اور سمجھنے کی کوشش ملتی ہے۔ یہ کوشش اشاراتی اور ایمائی انداز میں بھی ہے اور سیدھے سادے بیانیہ اسلوب میں بھی، ان کا غور و فکر کہیں کہیں انھیں احتجاج پر بھی اکساتا ہے لیکن یہ احتجاج ایک ہلکی سی دردمندی سے آگے نہیں بڑھتا۔ اور یہ ان کی خوبی ہے۔ چیزوں کے سیاہ و سفید دونوں رخ پیش کر کے اپنی بات میں اثر پیدا کرنا ایک عام طریقہ ہے غافر شہزاد اس تکنیک

کو فن کارانہ طور پر استعمال کرتے ہیں۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے، ہمارے ہاں افسانوں میں زبان پر محنت کرنے کا رواج ختم ہوتا جا رہا ہے۔ غافر شہزاد اس حقیقت سے باخبر ہیں اور ان کی یہ باخبری ہی انہیں زبان کی طرف توجہ دینے پر آمادہ کرتی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ زبان کا تخلیقی استعمال کہانی کو اس کی معراج عطا کرتا ہے۔ غافر شہزاد نے ابھی اپنے سفر کا آغاز کیا ہے ان کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے اور وہ کہنے کا سلیقہ بھی جانتے ہیں۔ اچھے ادب کا مطالعہ اور محنت یقیناً انہیں اپنا منفرد راستہ بنانے میں مدد دے گی۔

۹، جنوری ۱۹۹۵ء

حقیقت پسندی کی نئی روایت کا افسانہ نگار

ہمارے ہاں زرعی بورژوازی سے تعلق رکھنے والے ادبی جدیدیت پسند ہوں یا متوسط طبقے سے ابھرنے والے، دونوں کی کوششیں یہی رہی ہیں کہ ادبی حقیقت پسندی کو ایک غیر تخلیقی اور فرسودہ رجحان اور ادبی جدیدیت کو واحد جدید ترین تخلیقی رجحان کے طور پر تسلیم کرائیں۔ مگر ادبی حقیقت پسندی ایسی سخت جان ہے کہ مٹائے نہیں مٹتی بلکہ سماجی اور فنی و تکنیکی ترقیوں کے ساتھ مسلسل ارتقاء پذیر ہے اور ارتقائی صورت میں ہر نئی نسل کے اہلِ قلم میں اپنی جگہ بنالیتی ہے۔

پاکستانی افسانے میں ساتویں دہائی کے آس پاس جب عسکری آمریت کے زیرِ سایہ ادبی جدیدیت میں بھی زبردست ابھار آیا، حقیقت پسندی کی روایت میں بھی تبدیلیاں آنے لگیں اور آٹھویں دہائی تک اور اس کے بعد یہ تبدیلیاں حقیقت پسند اُردو افسانے کے نئے نمایاں اوصاف میں ڈھل گئیں۔ اب توضیح پسندی اور تفصیل نگاری کی جگہ اشارہ پسندی اور اختصار نویسی نے لی۔ اور کرداروں کی خارجیت کے ساتھ ان کی داخلیت کے مشاہدہ و مطالعہ اور ترجمانی کا رجحان بڑھا۔ اُردو افسانے میں موجودہ حقیقت پسندی بعض مثبت پہلوؤں سے ساتویں دہائی سے پہلے کی حقیقت پسندی سے ہم

رشتہ ہونے کے باوجود اس سے واضح طور پر مختلف ہے۔ غافر شہزاد مجموعی طور پر حقیقت پسندی کی اس نئی روایت کے جواں سال افسانہ نگار ہیں۔

غافر شہزاد نے بیسویں صدی عیسوی کے نویں عشرے کے تقریباً ساتھ ساتھ ہی لکھنا شروع کیا۔ جب ملک پر دوسری اور قدامت پرست عسکری آمریت مسلط تھی، جس نے متوسط طبقے کے ادبی جدیدیت پسندوں کو بھی ترقی پسندوں اور جمہوریت پسندوں کے قریب ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ غافر شہزاد نے اسی عشرے کے آخری سال میں "تصویریں سانس لیتی ہیں" کے نام سے اپنا پہلا افسانوی مجموعہ پیش کیا۔ جس میں حقیقت پسندی کا اندازِ فکر و احساس ان کے بیشتر افسانوں کے ساتھ ایک نیم افسانے "ماں سے مکالمہ" میں بھی موجود ہے جس میں وہ لکھتے ہیں۔۔۔

"مجھے جو کچھ معاشرے نے دیا اس کو تمام تر صد قتوں کے ساتھ لوٹا رہا ہوں۔"

(تصویریں سانس لیتی ہیں صفحہ ۱۲۳)

یہ فقرہ پڑھ کر ساحر لدھیانوی کا یہ مشہور شعر یاد آتا ہے کہ

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں

جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

غافر شہزاد کے فقرے اور ساحر لدھیانوی کے شعر سے مغالطہ پیدا ہو سکتا ہے کہ شاید دونوں ادبی نیچرلزم کے قائل ہیں۔ جبکہ فی

الحقیقت اپنے اپنے شعبہ ادب میں دونوں رئیلٹ (حقیقت پسند) ہیں۔ جو نیچرلزم سے مختلف طریقِ کار ہے۔ بہرحال غافر شہزاد نے حقیقت پسندی کی ارتقاء یافتہ روایت میں افسانہ لکھنے سے اپنا سفر شروع کیا۔ اور اپنے پہلے مجموعے ہی سے اپنے قارئین کو یہ خوشگوار حیرت بخشی کہ اس نوجوانی ہی میں جدیدیت کی داخلیت پسندی کی بجائے کرداروں کی داخلیت کو معروضیت کے ساتھ دیکھنے اور دکھانے کا فنی روّیہ رکھتے ہیں اور اس طریقِ کار میں اپنی منفرد فنی جمالیتی انفرادیت کی تشکیل کر رہے ہیں۔

"خوابوں کی گرد میں پڑی لڑکی" غافر شہزاد کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کے افسانے پچھلے چند برسوں میں لکھے گئے ہیں ہر چند ان کے اس مجموعے میں بھی کچھ علامتی و استعاراتی افسانے موجود ہیں۔ جو فکری روّیے کے اعتبار سے حقیقت پسندانہ ہیں اور جدیدیت پسندوں کے برعکس معنوی ابلاغ کے حامل ہیں۔ تاہم اس مجموعے میں بھی ان کا غالب رحجان حقیقت پسندی کے غیر علامتی و استعاراتی اظہار کی طرف ہے۔

غافر شہزاد کے افسانوں کے کردار نہ تو جدیدیت پسندوں کے محبوب، بے چارگی کے مارے ہوئے اینٹی ہیرو ہیں اور نہ عامیانہ فکشن کے سُپر ہیرو، کہ یہ دونوں غیر حقیقت پسندانہ ناانسانی صورتیں ہیں۔ ان کے کردار ہمارے سماج کے عام افراد ہیں جو

بورژوائزیشن کے بڑھتے ہوئے رشتوں اور مظاہر میں خارجی اور داخلی آشوب سے دوچار ہیں جو مختلف شکلوں کی مغائرت، انفرادیت کی شناخت کھو جانے اور انسانی سطح پر نہ جی سکنے کا ہے۔ جس کو وہ انسان کے بحیثیت ایک نوعی ہستی کے، اعلیٰ انسانی اقدار کے ساتھ جینے کی تمنا اور سعی کے ہمراہ پیش کرتے ہیں۔

غافر شہزاد کے حقیقت پسندانہ افسانوں میں جمالیت کی تخلیق کے شعری عناصر تشبیہات واستعارات کا استعمال پہلے بھی کم تھا۔ اس مجموعے کے حقیقت پسندانہ افسانوں میں یہ عناصر برائے نام رہ گئے ہیں۔ وہ واقعیت کے حامل واقعات کو غیر تشبیہاتی و استعاراتی پیرائے میں پیش کرتے ہوئے ان کے ذریعے اپنے کرداروں کی بدلتی ہوئی داخلیت کو سامنے لاتے ہیں۔

یوں انھوں نے سادہ بیانیہ کے ساتھ داخلیت کی ترجمانی اور جمالیت کی تخلیق کی ایک بڑی ذمہ داری اپنے سر لی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے توضیح و تفصیل کی بجائے اختصار پسندی کو بھی اپنایا ہے۔ اس طرح اپنا سفر مزید دشوار کر لیا ہے۔ یہ ذمہ داری بڑی اور یہ سفر دشوار سہی وہ اس میں درجہ بدرجہ کامیابیاں حاصل کر رہے ہیں۔ اور ان کی فنی انفرادیت نکھرتی چلی جا رہی ہے۔

یوسف حسن

راولپنڈی

١٠- فروری ١٩٩٥ء

خواب اور خواہش کے درمیان

معلوم نہیں رات کا وہ کون سا پہر تھا جب اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ یوں تو نیند میں آنکھ کھل ہی جاتی ہے مگر سونے والے کو پتہ ہی نہیں چلتا اور وہ پہلو بدل کے پھر سو جاتا ہے بلکہ لکھنے والے تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ خواب دیکھتے ہوئے بھی کئی بار آنکھ کھل جاتی ہے مگر سونے والا پہلو بدل کر جب دوبارہ سو جاتا ہے تو خواب کا سلسلہ پھر وہیں سے شروع ہو جاتا ہے۔

ممکن ہے اس روز بھی ویسا ہی ہوتا مگر جب اس کی آنکھ کھلی تو اسے احساس ہوا کہ اس کا ہاتھ کسی نرم نرم شے کو چھو رہا ہے یہ سردیوں کی رات تو تھی نہیں کہ وہ سوچتا ایرانی کمبل کی نرمی کو چھو رہا ہے۔ بالکل ایک لمحے کا احساس تھا کہ خوف اس کی ریڑھ کی ہڈی میں اُتر گیا۔ جیسے آسمانی بجلی چمکنے کے بعد بھی دیر تک روشنی کی لکیر نظر آتی ہے۔

اس اچانک خوف کی کیفیت نے اسے یک دم بستر سے اُٹھایا نہیں بلکہ یونہی اسی حالت میں لیٹے لیٹے اس نے دو تین بار آنکھوں کو جھپکا اور یقین کر لینے کے بعد کہ اس کی آنکھیں پوری طرح دیکھ سکتی ہیں اور وہ بیدار ہو چکا ہے اس نے وہیں لیٹے لیٹے آنکھوں کو اس زاویئے سے گھمایا کہ وہ اس نرم نرم محسوس ہونے والی چیز کو دیکھ سکے۔

رات کے اس پہر میں چاندنی کھڑکی سے اندر آ رہی تھی مگر پردوں کی وجہ سے کمرہ

پوری طرح روشن نہیں تھا اس نیم اندھیری فضا میں اسے یہ جاننے میں قطعاً دیر نہ لگی کہ اس کا ہاتھ بلی کی پشت پر ہے۔

بلی اس لمحے تک اپنا منہ اگلے دونوں پاؤں میں رکھے شاید سو رہی تھی۔

سونے سے قبل اس نے کھڑکی بند کر دی تھی۔ جو پٹ کھلا تھا اس کے آگے جالی لگی تھی۔ البتہ دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ ویسے بھی اس نے رات سونے سے قبل ٹیرس پر کھلنے والا دروازہ خود بند کیا تھا۔ یہاں بھی کھڑکی کا وہی پٹ کھلا چھوڑا تھا جس کے آگے جالی لگی تھی اور بلی تو کیا مکھی کے بھی اندر آنے کی گنجائش نہیں تھی۔

تو پھر یہ بلی میرے کمرے میں کیسے آ گئی۔ ایک عجیب سے خوف کی لپیٹ میں وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہا تھا۔ مسلسل اس بات پر سوچے جا رہا تھا کہ بلی کے کمرے میں داخل ہونے والے ممکنہ راستے کون سے ہیں مگر تاحال معاملہ لاینحل تھا۔

اس دوران ہمت کر کے وہ اٹھ بیٹھا تھا اور اس سرسراہٹ پر بلی نے پہلے آنکھیں کھولیں اور چونکنی ہو کر بیٹھ گئی وہ اپنی جگہ خوف زدہ بستر پر ایک طرف سمٹ گیا تھا بلی پہلے تو اسی طرح بیٹھی رہی اور مسلسل اُس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر معلوم نہیں اسے اس کی آنکھوں میں کیا نظر آیا۔ چند لمحے یونہی بیٹھنے کے بعد بلی اُٹھی اس نے ایک انگڑائی لی اور پھر نہایت اطمینان سے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ادھ کھلے دروازے سے باہر نکل گئی۔

وہ تمام وقت جب بلی کمرے میں بیٹھی اسے دیکھتی رہی تھی اس نیم اندھیرے کمرے میں جہاں چاندنی کی معدوم روشنی پہنچ رہی تھی اسے بلی کی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی چمک سی نظر آئی تھی اور یہی چمک اس کے لیے باعثِ پریشانی تھی۔

اس کے تمام تر چاہنے کے باوجود بلی اس کی زندگی کے شب و روز سے نکل نہیں سکی اور یہ کوئی ایک مخصوص بلی نہیں تھی کہ جو اس سے اتنی مانوس ہو گئی ہو کہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی بلکہ مختلف وقتوں میں اور مختلف جگہوں پر یہ بلیاں تبدیل

ہوتی رہتی تھیں۔

ایک عرصے تک تو اسے احساس ہی نہ ہوا کہ یہ ایک بلی ہے یا مختلف وقتوں میں مختلف بلیاں ہیں۔ رنگ و نسل مختلف ہونے کے باوجود وہ کبھی ان میں امتیاز نہ کر سکا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اس کے ذہن پر کسی ایک بلی کے نقش اور رنگ واضح شناخت کے ساتھ ثبت ہی نہیں ہوئے، ایسے میں ظاہر ہے کہ وہ مختلف بلیوں میں کیسے امتیاز کر سکتا تھا۔

یہ بالکل ایسے ہی تھا کہ اوائل جوانی تک وہ مختلف کاروں میں فرق نہیں کر سکتا تھا اسے سوزوکی اور شیراڈ ایک جیسی بظاہر نظر آتی تھیں مگر ان کے مختلف ہونے کا احساس ضرور ہوتا تھا مگر وہ اس کی نشاندہی نہیں کر سکتا تھا۔ اس طرح سنی اور کرولا میں تمیز کرنا قدرے مشکل تھا مگر یہ تب تک تھا جب تک اس نے اس طرف توجہ نہیں دی تھی اب تو وہ دور جاتی ہوئی گاڑی کی ایک جھلک دیکھ کر اس کا ماڈل تک بتا دیتا تھا۔

مگر بلیوں کے معاملے میں وہ عجیب سی کنفیوژن کا شکار تھا۔ سوائے رنگ کے اور کوئی بھی نشانِ امتیاز نہیں تھا سو اس کی لغات سفید بلی سیاہ بلی یا بھوری بلی سے آگے نہ بڑھ سکی۔ مگر یہ بہت پہلے کی بات تھی۔

جب اس نے ہوش سنبھالا، اسے یاد پڑتا تھا کہ اس کی ماں نے ایک سفید بلی پال رکھی تھی جسے وہ روزانہ باقاعدگی سے دودھ پلاتی تھی۔ گھر میں دودھ کم ہونے کی وجہ سے چائے میں تو ناغہ ہو سکتا تھا مگر بلی کی خوراک میں کمی نہیں ہو سکتی تھی جب اس کی بہن بڑی ہوئی تو اپنی ماں کی تقلید میں اسے بھی بلیوں سے محبت ہو گئی اور نتیجتاً اس کی ماں کو اس کی بہن سے بے پناہ محبت ہو گئی۔

ایسا نہیں ہے کہ اسے بلیوں سے نفرت تھی مگر اسے کوئی ایسی رغبت بھی نہ تھی اس کے والد کا قالینوں کا کاروبار تھا اور وہ زیادہ تر بیرونی ممالک کے دورے پر رہتے یا پھر اپنے شوروم پر رات گئے تک مصروف رہتے کیونکہ اعلیٰ سے اعلیٰ نسل کے کارپٹ

کی خریدار بڑی بڑی گاڑیوں میں آنے والی بیگمات رات گئے تک شوروم پر آتی رہتی تھیں۔

اس کا زیادہ تر وقت گھر یا کالج میں کٹتا۔ ہر دو جگہ پر اسے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا گھر میں بھی ماں اور بہن کی موجودگی میں بھی وہ تنہا ہی ہوتا اور کالج میں بھی وہ کوئی خاص دوست نہ بنا سکا۔ نہ تو اسے کالج میں تنہائی نے کبھی ڈیپرس کیا تھا۔ اور نہ ہی گھر میں ماں اور بہن کی بلیوں کے لیے بے تحاشا محبت نے اسے کبھی ڈسٹرب کیا تھا۔ اس کے چہرے پر کبھی ناگواری کے تاثرات پیدا نہیں ہوئے تھے مگر اس کے باوجود کبھی اس کے دل میں یہ خواہش بھی پیدا نہیں ہوئی کہ وہ ان بلیوں میں سے کسی کو ہاتھ لگائے، اٹھائے یا بستر پر سلائے مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ ان بلیوں کی موجودگی کو وہ محسوس نہ کرتا تھا۔

پہلے پہلے کبھی کبھار ماں اس کو دودھ دیتی تھی کہ وہ بلی کو پلا دے۔ مگر اس کی طرف سے بالکل غیر جذباتی رویہ دیکھ کر یہ چیز بھی آہستہ آہستہ ختم ہو گئی تھی۔

البتہ اس کا والد جب فارغ ہوتا تو لاؤنج میں یا لان میں بلی کو گود میں بٹھائے اس کے نرم بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک عجیب سی لذت محسوس کرتا تھا۔ اس کی آنکھیں بوجھل سی ہونے لگتیں اور وہ نیم غنودگی کی کیفیت میں چلا جاتا۔ بعض اوقات میز پر پڑی چائے ٹھنڈی ہو جاتی مگر اسے احساس ہی نہ ہوتا تھا ہر بات اس نے نوٹ کی تھی۔ مگر ایسے ہی جیسے نوٹ کرتا تھا ویسے ہی بھلا دیتا تھا اس کے والد کی گھر میں اس سے زیادہ کوئی مصروفیت نہ ہوتی تھی۔ کبھی کوئی اس سے ملنے نہیں آیا۔ دوست احباب سے تعلق جو کہ محض بزنس کا ہی تھا شوروم تک ہی محدود تھا۔

البتہ اس کی ماں خاصی چلت پھرت عورت تھی اور زندگی کو خوب طمطراق سے گزار رہی تھی ویسے بھی جو وہ چاہتی تھی گھر میں ایسا ہی ہوتا تھا۔ وہ جیسا رنگ چاہتی تھی گھر کی فضا ویسے ہی ہو جاتی تھی۔ اسے مزاحمت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ بازار جاتی تو

ڈھیر ساری شاپنگ کرتی۔ اپنی پالتو بلیوں کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لاتی۔ فون پر اپنی سہیلیوں سے طویل گفتگو اس کی دن بھر کی مصروفیت کا اہم حصہ تھی۔

چار افراد پر مشتمل گھرانے کی زندگی معمول کے مطابق چل رہی تھی پھر یوں ہوا کہ گھر میں کچھ آمد و رفت شروع ہو گئی۔ ہفتے دس دن کے بعد کچھ مہمانوں کو کھانے پر بطورِ خاص مدعو کیا جانے لگا۔ کبھی اس کی ماں اور بہن بھی اس طرح کے کھانے پر مدعو ہوتیں۔ اس نے کبھی شرکت نہیں کی۔ سچ پوچھئے تو اس کی شرکت پر کسی نے اصرار بھی نہیں کیا۔ اس گھما گھمی کا نتیجہ نکلا اور ایک دن اس کی بہن سسرال کو سدھاری۔ چند دنوں کے بعد گھر کی فضا پھر ویسی ہی ہو گئی۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ ساکن، سسرال سے پہلی مرتبہ جب اس کی بہن میکے آئی تو اس نے ماں سے ملنے کے بعد اپنی بلیوں کو ڈھیر سارا پیار کیا۔ دیر تک ان کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی۔ انھیں بھینچتی رہی۔

اس کی بہن کے سسرال چلے جانے کے بعد گھر تقریباً خاموش قبرستان کی صورت اختیار کر گیا۔ جہاں کبھی کبھار اس کی ماں کی فون پر گفتگو فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتی ورنہ اکثر یوں لگتا۔ جیسے ہوا ساکن ہو گئی ہو۔

اور پھر ایک دن ہوا کا ایک خوشگوار جھونکا اس گھر میں آنکلا۔ اس کی شادی ہو گئی اس کی بیوی اس کی ماں کا ہی انتخاب تھی۔ بہت ہی سرخ و سفید، لمبے اور گھنے بالوں اور سبز آنکھوں والی اس کی بیوی کا خیال تھا کہ جاتے ہی وہ میاں کو اپنے حسنِ ادا سے دیوانہ کر دے گی۔ پڑھی لکھی فیملی سے تھی۔ مگر سمجھدار اور قدرے چالاک، سہاگ رات ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کا میاں برف کی سل ہے، اور نرمی اور گرمی دونوں چیزیں اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ پڑھی لکھی تھی دل میں ہزاروں ارمان لے کر آئی تھی، لہذا جلدی مایوس ہونا نہیں چاہتی تھی اس نے اپنی کوششیں جاری رکھیں مگر بے سود، خاوند نے اس کے لیے تعریف کے دو جملے تو دور کی بات، اس کے سراپے کو کبھی نظر بھر کے دیکھا بھی نہیں تھا۔ شادی کے چند ہفتے بعد ہی ایک ہلکا سا احساسِ شکست پیدا ہونے

لگا تھا اس کا خیال تھا کہ وہ آج نہیں تو کل اپنے خاوند کو سپردگی کی لذتوں سے سرشار کر کے اس کے اندر ایک قبولیت پیدا کر لے گی۔

اس کی سہیلیوں نے اپنے خاوندوں کے حوالے سے جو قصے سنائے تھے۔ یہاں تو صورتِ حال بالکل مختلف تھی بلکہ ان قصوں کی صداقت مشکوک ہو گئی تھی۔ کئی ہفتے گزر گئے، جب خاوند کی طرف سے پہل کرنے کی کوئی خاص خواہش نظر نہ آئی تو اس نے خود ہی پہل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

رات کمرے کی نیم تاریکی میں اس نے خاوند کے گلے میں بانہیں ڈال کر کتنی دیر تک اسے بھینچے رکھا اس کے کھلے بال کتنی دیر تک اس کے چہرے پر بکھرے رہے اس نے اپنے سرخ و نرم ہونٹوں کی لپ اسٹک تقریباً تمام ہی اپنے خاوند کے ہونٹوں پر منتقل کر دی مگر اس کی طرف سے کسی پُرجوش شرکت کا ہلکا سا شائبہ بھی نہیں ہوا۔

یہ نہیں تھا کہ اس کا خاوند عملِ زوجیت کی قوت سے محروم تھا مگر ایک کمی تھی اور وہ پُرجوش شرکت کی عدم موجودگی۔ رات جب وہ خاوند کے جسم سے لپٹی تو یوں لگا جیسے پتھر کی ٹھنڈی سل کو گلے لگا لیا ہو اس ساری صورتِ حال نے اس کی بیوی کو عجیب سی الجھن میں ڈال دیا تھا۔ وہ پڑھی لکھی فیملی سے تھی اور جدید علوم سے بھی بہرہ مند، مگر جس صورتِ حال کا اسے سامنا تھا اور جس سے وہ گزر رہی تھی اس کا کوئی حل اس کے پاس موجود نہیں تھا۔

بات اگر یہیں تک رہتی تو شاید صورت حال زیادہ سنگین نہ ہوتی۔ چند مہینوں کے بعد ایک عجیب انکشاف ہوا۔ رات سوتے میں اگر کبھی اس کے خاوند کا ہاتھ اس کے کھلے بالوں پر پڑ جاتا، اور اس کی آنکھ کھل جاتی تو وہ عجیب سے خوف میں مبتلا ہو جاتا۔ چونک کر اپنا ہاتھ کھینچ لیتا اور پھر کتنی کتنی دیر تک اس کی سانس کی رفتار متوازن نہ ہوتی۔

پہلے تو اسے یقین نہ آیا مگر جب تواتر سے یہ عمل دہرایا گیا تو وہ پریشان ہو گئی تمام تر کوشش کے باوجود بھی اسے سمجھ نہ آسکی کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے۔

وہ اس پتھر کی سِل کے پہلو میں لیٹے ساری ساری رات اس مسئلے کو حل کرتی رہتی۔ مگر کوئی گرہ نہ کھلتی تھی بعد میں تو اس کے خاوند نے باقاعدہ خوف زدہ ہونا شروع کر دیا۔ رات جب کبھی اس کا ہاتھ یا بازو اس کے بالوں پر پڑجاتا اور اس کی آنکھ کھل جاتی تو وہ گھبرا کر سمٹ کر ایک طرف ہو جاتا۔ اس کی سانسیں تیز ہو جاتیں اور جسم باقاعدہ کانپنے لگتا۔ کچھ عرصہ تو اس نے اس مسئلے کا کوئی حل نکالنے کی کوشش کی۔ مگر جب کچھ سمجھ نہ آئی تو اس نے علیحدہ بیڈ پر سونا شروع کر دیا۔

اس کا نتیجہ صرف یہ نکلا کہ اس کا خاوند زیادہ اطمینان سے گہری نیند سونے لگا اور وہ ساری ساری رات آنکھوں میں کاٹنے لگی۔

اگلے چند دنوں کے بعد ہی اس کی بیوی نے میکے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے خاوند کو اور ساس کو یہ خبر سنائی۔ ساس نے صرف اتنا کہا کہ جب دل چاہے فون کر دینا یہ تمہیں لے آئے گا مگر وہ جس نے لانا تھا نہ تو اس کی آنکھوں میں کوئی تاثر ابھرا اور نہ ہی چہرے پر کوئی پھول کھلا، وہ خاموش، چپ چاپ رخصت ہو گئی اور وہ پھر کمرے میں اکیلا سونے لگا، دن ویسے ہی ہو گئے جیسے شادی سے پہلے تھے۔

اور یہ انہی دنوں کی بات ہے کہ جب رات سوتے ہوئے اچانک اس کی آنکھ کھل گئی اور اس نے اپنا ہاتھ نرم نرم بالوں پر محسوس کیا تھا اور وہ چونک گیا تھا۔ بلکہ خوف زدہ ہو گیا تھا کمرے کی نیم تاریکی میں بلی کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے اسے بیوی کی سبز آنکھیں یاد آ گئی تھیں۔

اس کے جاگ جانے کے بعد بلی تو کمرے سے باہر نکل گئی مگر کمرے میں تنہائی بھر گئی تھی۔ رات کے اس خاموش پہر میں بلی کو آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکلتے دیکھ کر ایک عجیب سی کیفیت اس پر طاری ہو گئی تھی اسے پہلی مرتبہ احساس

ہوا کہ وہ کمرے میں اکیلا ہے۔

وہ اٹھ کے بیٹھ گیا اس نے ٹیبل لیمپ نہیں جلایا، اور کتنی دیر تک یونہی ساکت و جامد ادھ کھلے دروازے کی جانب دیکھتا رہا جہاں سے بلی نکل کر باہر گئی تھی۔

اسی طرح بیٹھے بیٹھے صبح ہو گئی۔ نہا دھو کر جب ناشتے کی میز پر پہنچا، تو وہی بلی وہاں موجود تھی اس نے ایک کپ میں تھوڑا سا دودھ ڈالا، اور بلی کی طرف بڑھا دیا۔ بلی پہلے رکی پھر بڑھی اور اطمینان سے دودھ پینے لگی۔

غیر ارادی طور پر اس نے بلی کے نرم نرم بالوں پر ہاتھ پھیرا اور جب تک بلی دودھ پیتی رہی وہ ہلکے ہلکے اس پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ دودھ پی چکنے کے بعد اس نے ہولے سے بلی کو دونوں ہاتھوں میں اٹھایا اور گود میں بٹھا لیا اور اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔ ایک عجیب سی لذت تھی جو اس کے اعصاب میں رینگنے لگی۔ وہ اس لذت سے پہلے آشنا نہیں تھا اس کے لیے بالکل نیا تجربہ تھا بلی نے ایک دو بار آنکھیں کھولیں اس کی طرف دیکھا اور پھر اطمینان سے آنکھیں بند کر کے یونہی لیٹی رہی وہ اس کے نرم نرم بالوں میں ہاتھ پھیرتا رہا۔ حتیٰ کہ خود اس کی آنکھیں بھی مختلف نوعیت کی لذت سے بوجھل ہونے لگیں

(اکتوبر ۱۹۹۳ء)

☆☆☆

اپنا اپنا سچ

ہنڈا ٹریل پر جب وہ مخصوص راستے سے اسٹیڈیم میں داخل ہوا۔ تو وہاں پہلے سے موجود ہزاروں تماشائیوں نے کھڑے ہو کر بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا اور اس کا نام لے لے کر بہت اونچی آواز میں نعرے لگائے اور اس کی کامیابی کے لیے ڈھیر ساری دعائیں کیں۔ اتنے سارے لوگوں کو اپنے سامنے پا کر ایک عجیب سی چمک اس کی آنکھوں میں ابھر آئی۔ اس کی چھاتی پھول کر اور بھی چوڑی ہو گئی۔ اس کی رگوں میں گردش کرتا ہوا خون اتنا تیز ہو گیا جیسے ابھی رگیں پھاڑ کر باہر پھوٹ بہے گا۔ زندگی کے تیئس سالوں میں پہلی مرتبہ وہ اس کیفیت سے گزر رہا تھا۔ تمام جسم کا خون سمٹ کر اس کی پیشانی اور گالوں میں جمع ہو گیا تھا۔ دیکھنے والے کہتے ہیں انہوں نے اتنا بھرپور اور خوبصورت جوان اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

اس نے ہنڈا ٹریل کھڑی کی۔ اتر کر چاروں اطراف تماشائیوں کو جھک کر سلام کیا اور دوبارہ ہلمٹ پہن لی اور ٹریل پر سوار ہو گیا۔ اس نے پہلے پوری سپیڈ سے ایک چکر مکمل کیا اور دوسرے چکر میں تمام قوتیں ایک نقطہ پر مرتکز کر کے اس نے انتہائی ممکن سپیڈ میں ٹریل دوڑائی اور مخصوص ریمپ سے ایک پُر اعتماد توازن کے ساتھ اس کنارے کی جانب بڑھا جہاں سے اس نے جمپ کر کے بچیس کاروں کے اوپر سے گزرنا

تھا۔

ایک جھٹکے سے اس کی ٹریل کے ٹائروں نے زمین کو چھوڑا اور ممکنہ زاویئے سے فضا میں بلند ہوا کہ جمپ کا مطلوبہ فاصلہ طے کر سکے۔ ایک دو تین۔۔۔۔۔ بیس اکیس بائیس کاروں کے اوپر سے گزر گیا۔۔۔۔۔ یہاں تک تو اس کے اور لوگوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں تھا۔ جو وہ کہتا تھا سبھی لوگ اس کی تائید کرتے تھے۔ مگر اس کے بعد کیا ہوا۔ ہر دو فریقین کے بیانات مختلف تھے۔

لوگ آنکھوں دیکھا احوال یوں بیان کرتے تھے کہ "تئیسویں کار تک پہنچ کر اس کی ٹریل کا پچھلا پہیہ ونڈ اسکرین پر لگا اور چوبیسویں پچیسویں کاروں کی ونڈ اسکرین کو توڑتا ہوا ریمپ اور آخری کار کے درمیانی وقفے میں جا کر پھنس گیا۔ وہ خود ہوا میں تیرتا ہوا گردن کے بل لوہے کے بنے ہوئے ریمپ پر گرا اور دو قلابازیاں کھا کر رک گیا اور پھر کبھی نہیں اٹھا۔ ہلکی سی موہوم سی حرکت بھی اس نے نہیں کی۔ تماشائی اٹھ کھڑے ہوئے اور چیختے ہوئے اس کی جانب دوڑے اس غیر متوقع صورتحال میں ان کے نرخروں سے ایسی دہشت انگیز آوازیں نکل رہی تھیں جیسے بہت سے غیر مرئی ہاتھ ایک ہی وقت میں بے شمار لوگوں کا گلہ دبا رہے ہوں۔ لوگوں کے وہاں تک پہنچنے سے قبل ہی ایک ایمبولینس اچانک نمودار ہوئی اور اس کو اگلے چند منٹ میں قریب واقع سی۔ ایم۔ ایچ لے جایا گیا۔ ڈاکٹر کا بیان یہ تھا کہ نوجوان موقع پر ہی دم توڑ گیا تھا۔ گرتے ہوئے تمام بوجھ گردن پر پڑا اور گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔"

مگر نوجوان کا بیان اس سے قطعی مختلف تھا۔ بقول اس کے "اکیسویں، بائیسویں کار کے بعد تئیسویں، چوبیسویں اور پچیسویں کار کے اوپر سے گزرنے کے بعد اس کی موٹر بائیک کے دونوں پہیے لوہے کے ریمپ پر یکے بعد دیگرے اترے اور وہ پورے اعتماد سے بائیک کی سپیڈ آہستہ کرتے ہوئے ریمپ کے آخری سرے تک گیا۔ اس نے بالکل آغاز کی طرح بائیک کھڑی کی، ہلمٹ اتارا اور چاروں طرف تالیاں

بجاتے شور مچاتے تماشائیوں کو اس نے سلام کیا اور یوں اس نے ایشیاء کا موٹر بائیک جمپ کا ریکارڈ قائم کیا۔ بہت زیادہ کریدنے پر البتہ اس نے ایک شبہ کا اظہار کیا "شاید آخری دو یا تین کاروں کی چھتوں سے اس کی بائیک کا پچھلا پہیہ ہلکا سا ٹکرایا تھا یا پھر شاید ٹکراتے ٹکراتے بچ گیا تھا۔ اسے شک تھا شاید ایسا ہوا۔ ہو سکتا ہے، شاید ایسا نہیں ہوا تھا۔ بس یہ آخری بات تھی جہاں پر وہ رک جاتا تھا اور لوگ بولتے چلے جاتے تھے۔

مگر اسے اپنی حسیات پر پورا اعتماد تھا اور کئی بار اس نے کہا بھی کہ اگر ایسا ہوا ہوتا تو یقیناً اسے معلوم ہوتا۔ جب اس کی بائیک ہوا میں تیرتی ہوئی کاروں کے اوپر سے گزر رہی تھی تو ایک ایک لمحہ کا منظر اس کی آنکھوں میں زندہ تھا۔ یہاں تک کہ ہوا میں اڑتے ہوئے اس کے لباس سے جو آواز پیدا ہو رہی تھی وہ بھی اس نے سنی تھی اور اس سرسراہٹ کو اپنے کانوں میں محفوظ کیا تھا۔

وہ چیخ چیخ کر اپنی عظیم الشان کامیابی کا حال لوگوں کو سنانا چاہتا ہے۔ مگر کوئی فرد واحد بھی اس کی بات سننے کے لیے تیار نہیں۔ سب لوگ یہ کہتے ہیں وہ مر چکا ہے۔ ڈاکٹری سرٹیفکیٹ کے مطابق بھی وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا تھا۔ وہ پوری آواز سے چیختا ہے مگر لوگ اس کا نوٹس ہی نہیں لیتے، جیسے انھیں اس کی آواز سنائی ہی نہیں دے رہی۔

اور آج یہ پہلی مرتبہ نہیں ہوا تھا۔ وہ جب پیدا ہوا تھا اور ابھی سال بھر کا بھی نہیں ہوا تھا تب سے ایسا ہو رہا تھا۔ اس کی ماں بتاتی ہے۔ کہ چھوٹے بچے لیٹے لیٹے جھولنے سے گر تو پڑتے ہی ہیں اور انھیں چوٹ بھی نہیں آتی مگر وہ جان بوجھ کر جھولنے سے گرتا تھا اور ایک وقت میں کئی کئی مرتبہ گرتا تھا۔ ادھر وہ گرا اس نے چیخنا شروع کر دیا۔ اس کی ماں نے اسے اٹھا کر دوبارہ جھولنے میں ڈال دیا اور ایک لمحے کے لیے اس کی توجہ ادھر سے ہٹی اور وہ دھڑام سے نیچے گرا۔ مگر کبھی بھی اسے چوٹ نہیں آئی۔ وہ زخمی نہیں ہوا اس کی ٹانگ یا بازو وغیرہ نہیں ٹوٹا۔ زیادہ سے زیادہ چوٹ والی

جگہ پر سوجھن ہو جاتی۔ وہ بھی ایک آدھ دن کے لیے اور وہ پھر ویسے ہی ہو جاتا جیسے پہلے ہوتا تھا۔

"بہت چھوٹا سا تھا" اس کی ماں بتاتی ہے "شاید پرائمری سکول کی کسی جماعت میں، جب اس نے ایک روز اچانک تین پہیوں والی سائیکل کا ایک پہیہ اٹھا کر دو پہیوں پر اسے چلانا شروع کر دیا تھا۔ ہمارے بارہا منع کرنے کے باوجود بھی وہ وہی کرتا جیسے اس کا دل چاہتا تھا۔ اس معاملے میں بہت ضدی تھا۔ کسی کی نہیں مانتا تھا۔ حتیٰ کہ والد کے کہنے پر بھی کان نہ دھرتا۔ بہت چھوٹا سا تھا جب اس نے والد سے چوری ان کی سائیکل چلانا شروع کر دی تھی۔ دو پہیوں والی سائیکل کے پیڈل تک اس کے پاؤں پہنچنے کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ سائیکل کے فریم میں پاؤں ڈال کر اسے چلاتا تھا۔ شروع سے ہی دبلا پتلا اور لچکدار جسم کا مالک تھا اور اس چیز کا اسے بہت فائدہ رہتا تھا۔ درختوں پر پلک جھپکتے چڑھ جانا اور پھر ٹہنی پکڑ کر ایک درخت سے دوسرے پر جھول جانا اس کی دن بھر کی مصروفیت کا ایک اہم حصہ ہوتا تھا۔ کئی مرتبہ ٹہنیاں ٹوٹیں، درختوں سے گرا، پتہ نہیں کیسے ہر مرتبہ بچ جاتا تھا اور کوئی شدید چوٹ نہیں آتی تھی۔

ہائی سکول پہنچا تو باسکٹ بال اس کا پسندیدہ ترین کھیل ٹھہرا۔ فاصلہ کتنا ہی ہوتا زاویہ کیسا ہی ہوتا، اتنی سہولت سے بال باسکٹ میں پھینکتا تھا۔ کہ تماشائی سانس روکے رکھتے۔ میں نے جتنے میچ دیکھے، مجھے یاد نہیں پڑتا کبھی اس نے بال پھینکا ہو اور وہ خطا ہوا ہو۔

کالج میں پہنچا تو پہلے سال ہی سالانہ کھیلوں کے موقع پر بانس کی مدد سے ہائی جمپ میں اس نے ریکارڈ قائم کیا اور ڈویژن کے کالجوں میں آج تک اسے کوئی نہیں توڑ سکا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے جمپ لگاتے دیکھا تھا۔ بالکل مچھلی کی طرح ہوا میں تیرتا ہوا وہ اتنی بلندی سے کود گیا تھا۔ اس وقت کی اس کی تصویر اخباروں میں چھپی تھی میں نے آج تک سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔ وہ پائیلٹ بننا چاہتا تھا۔ ہوا میں اڑنا اس کا خواب تھا جس کی تکمیل وہ کھلی آنکھوں سے چاہتا تھا ایف اے کرنے کے بعد اس نے

دو مرتبہ پائیلٹ بننے کا امتحان دیا۔ مگر دونوں مرتبہ ہی طبی معائنے میں رہ گیا۔ مگر اس نے ہمت نہیں ماری۔ اس نے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا۔ بہت سمجھایا مگر جیسے ایک مقام پر آکر اس کی سوئی رک سی گئی۔ کسی کی نہیں مانی۔ بس بھوت سوار ہو گیا موٹر سائیکل کو ہوا میں اڑانے کا بھوت۔ دن رات اسی کے بارے میں سوچتا رہتا۔ باتیں کرتا رہتا، کتابیں پڑھتا رہتا، شروع شروع میں ہم لوگوں نے اس کی توجہ تعلیم مکمل کرنے کی طرف دلائی مگر بے سود۔ پھر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اس کے بعد جو ہوا وہ آپ سب لوگوں کے سامنے ہے۔

اتنا کہہ کر اس کی والدہ خاموش ہو گئی اور وہ پھر بول پڑا۔

میں کوئی غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک نہیں ہوں۔ بلکہ عام سا جذباتی نوجوان ہوں۔ جو کچھ کر گزرنے کی تمنا دل میں رکھتا ہے۔ بس مجھ میں اور باقی لوگوں میں صرف ایک ضد کا فرق ہے۔ کچھ بھی کرنے کی خواہش پیدا ہو جائے تو وہ کام میری ضد بن جاتا ہے۔ جسے کتابوں میں عزم صمیم لکھا گیا ہے۔

ہوا میں اڑنا بھی میری ضد تھی اور میرے سامنے کوئی بھی مزاحمت کی دیوار نہیں ٹھہر سکی اور میں نے وہ کچھ کر دکھایا ہے جو میں کرنا چاہتا تھا۔"

نوجوان کی آنکھوں میں بلا کا اعتماد اور چہرے پر بھرپور زندگی کا تاثر تھا۔

میں نوجوان کی والدہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ پھوٹ کر بہہ رہے تھے۔ دکھ کا احساس مجھے بھی بھگو گیا۔ گیلی سی کی سوندھی خوشبو نے مجھے چونکا دیا۔ جیسے ابھی ابھی کسی نے زمین کھودی ہو۔ اور گیلی مٹی کی ایک ڈھیری سی بنا دی ہو۔

گیلی مٹی کی ڈھیر ساری خوشبو میں نے اپنے اندر بھر لی اور یہی وہ لمحہ تھا جب مجھے احساس ہوا کہ اس اتنے بڑے ہجوم میں واحد میں ایسا شخص ہوں جسے یہ ایقان حاصل ہو گیا ہے کہ نوجوان سچ کہہ رہا ہے۔

☆☆☆

(۷ر اپریل ۱۹۹۴ء)

گرین ہاؤس

وہ صبح گزری صبحوں سے کئی حوالوں سے مختلف تھی۔
اس صبح خود ہی اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے بہت گہری اور طویل نیند سے بیدار ہوا ہے کہ خود کو بہت تازہ دم اور ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ نیند کتنی بڑی نعمت ہے آج پہلی مرتبہ اسے اس بات پر یقین آیا تھا۔

اُس کے لیے یہ بات قدرے حیران کن تھی۔ پہلی مرتبہ ایسا ہوا تھا۔ بلکہ بہت سالوں کے بعد آج پہلی مرتبہ کسی کے جگائے بغیر اس کی آنکھ صحیح وقت پر کھل گئی تھی اور اس نے بیدار ہونے کے چند لمحوں بعد ہی بستر چھوڑ دیا تھا۔ عام طور پر اس کی بیوی دوسری تیسری مرتبہ آکر اُسے جگاتی اور وہ خراب مزاج، بوجھل ذہن اور ناگواری کے احساس کے ساتھ بستر چھوڑتا تھا۔ اسے یوں لگتا کہ ابھی ابھی تو اس کی آنکھ لگی تھی۔ اتنی جلدی کیسے صبح ہو گئی۔ ابھی تو گذشتہ طویل دن کی تھکاوٹ اس کے بدن میں ہی تھی۔ پہاڑ جیسے دن کی مشقت کا احساس اکثر اسے ہلکان کیے رکھتا۔

مگر آج صبح تو کمال ہی ہو گیا۔ اس کی بیوی کچن میں ہی تھی مگر ابھی برتنوں کی کھنکھناہٹ سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ اس سے بھی بہت پہلے اٹھ گیا تھا اور بہت تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ اس نے بستر سے باہر چھلانگ لگائی اور باتھ روم میں گھس گیا۔

نہانے اور شیو بنانے کے بعد وہ تولیہ ہاتھ میں لیے بالوں کو پونچھتا ہوا جب باہر نکلا تو بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر پڑی چائے سے اٹھتی گرم گرم بھاپ نے اسے مسحور کر دیا۔
"زندگی کتنی پرلطف ہے۔" اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔

چائے ہاتھ میں لیے وہ لاؤنج کے اس کونے کی طرف آ گیا جہاں ناشتے کی میز پڑی تھی اور جہاں لگی کھڑکی سے مرکزی صحن (Atrium) میں لگی بیلیں اور انڈور پلانٹس (Indoor Plants) کا براہِ راست نظارہ ملتا تھا۔ اس مرکزی صحن میں لاؤنج کے علاوہ ڈرائنگ روم اور سٹڈی روم کی کھڑکیاں بھی کھلتی تھیں۔

زندگی اتنی پرسکون اور سبزہ اتنا اطمینان بخش بھی ہو سکتا ہے۔ یہ تجربہ اس کے لیے بالکل نیا تھا۔

بچے بھی تیار ہو کر ناشتے کے لیے اکٹھے ہو گئے تھے۔ انہوں نے اطمینان سے ناشتہ کیا اتنی دیر میں ان کی سکول بس آ گئی۔ ہارن سن کر وہ باہر بھاگے اور گھر میں صرف وہ اور اس کی بیوی رہ گئے۔

گھر میں مرکزی صحن اور اس میں لگے ہوئے رنگ برنگے پھول اس کی عمر بھر کی خواہش تھی جو دو سال قبل ہی پوری ہوئی تھی۔ مگر پھر بھی جو اطمینان آج اسے میسر آیا وہ اس کے لیے بالکل نیا تجربہ تھا۔ گھر کے اس مرکزی صحن کے اوپر والے حصے کو فائبر گلاس کی دودھیا چادر سے بند کر دیا گیا تھا اور مرکزی صحن میں سورج کی بالواسطہ شعاعیں تو آ سکتی تھیں مگر ہوا کا گزر اس کے اختیار میں تھا۔ سردیوں میں وہ ہوا کی نکاسی کے تمام راستے بند کر دیتا اور یوں مرکزی صحن ایک گرین ہاؤس بن جاتا۔

اس کا فائدہ اسے یہ ہوتا تھا کہ دن کے وقت سورج کی شعاعیں مرکزی صحن پر پڑی چھت کی دودھیا چادر سے اندر داخل ہوتی تھیں اور اُس میں جمع شدہ کاربن ڈائی آکسائیڈ کے باعث درجہ حرارت بہت مناسب سطح پر رہتا اور دسمبر کی شدید سردیوں میں بھی اس کے پودے اور پھول سبز رہتے۔ کبھی کبھار اگر درجہ حرارت تجاوز کرنے لگتا تو وہ

مرکزی صحن کی وہ کھڑکی جو ٹیرس کی جانب تھی کھول دیتا کچھ دیر کے بعد جب حرارت قدرے کم ہو جاتی تو دوبارہ کھڑکی بند کر دیتا۔ اس کے دوست احباب اس سے ملنے آتے تو سارا سال اس کے ہاں کھلے پھولوں اور سبز پودوں کو دیکھ کر بہت حیران ہوتے۔

اس نے چائے کا آخری گھونٹ پیا اور کپ میز پر رکھ دیا اور کچھ دیر کے لیے کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔ ایک مکمل اطمینان اس پر غالب تھا۔

اس کی بیوی نے اسے الوداعی بوسہ دیا اور بدن کی خوشگوار مہک اس کے ہمراہ کردی۔ پورچ میں کھڑی گاڑی چمک رہی تھی۔ گو نئی نہیں تھی مگر اس طریقے سے صاف کی گئی تھی کہ بالکل تازہ دم لگ رہی تھی۔ اس نے اگنیشن آن کیا اور اگلے لمحے میں گاڑی سٹارٹ ہو گئی۔ اس سے پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ خاص طور پر سردیوں میں تو انجن کو گرم ہوتے دیر لگ جاتی تھی۔ بلکہ بعض اوقات تو اسے دھکا لگا کر سٹارٹ کرنا پڑتا۔ بیوی کو خدا حافظ کہہ کر وہ سڑک پر آ گیا۔

سڑک پر تمام ٹریفک خلافِ معمول بہت قرینے سے رواں دواں تھی۔ وحدت روڈ سے جب وہ فیروز پور روڈ پر آیا تب بھی اسے کسی ذہنی تناؤ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ تمام گاڑیاں ایک ہی سپیڈ سے چل رہی تھیں کسی کو دوسرے سے آگے نکل جانے کی جلدی نہیں تھی اور نہ ہی کوئی ہارن پر ہاتھ رکھے ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا۔ راستے میں کہیں بھی کوئی گاڑی ایسی جگہ کھڑی نظر نہ آئی کہ جس کے باعث ٹریفک کی روانی میں کوئی مسئلہ پیدا ہوا ہو۔ یا کسی نے راستہ لینے کے لیے جھنجلا کر ہارن بجایا ہو۔ سورج کی شعاعیں بہت روشن اور چمکدار لگ رہی تھیں۔ کناروں پر اُگے درخت زیادہ سرسبز و شاداب لگ رہے تھے۔

ہر روز صبح جب وہ دفتر پہنچتا تھا تو گاڑی کی مناسب جگہ پر پارکنگ ایک مسئلہ ہی ہوتا تھا اور آتے ہوئے وہ دل میں یہی دعا مانگ رہا ہوتا کہ یا خدا اس مسئلے سے بچا۔ مگر

پھر بھی زیادہ دنوں میں ایسے ہی ہوتا تھا۔ کہ وہ اِدھر اُدھر جہاں جگہ ملتی گاڑی کھڑی کر دیتا اور چابی چوکیدار کے حوالے کر آتا۔ وہ بعد میں کوئی مناسب جگہ ملنے پر گاڑی پارک کر کے چابی اسے دے جایا کرتا تھا۔ مگر آج تو تمام گاڑیاں ایک ترتیب سے کھڑی تھیں اور ابھی مزید بہت جگہ باقی تھی۔ اس ترتیب اور قرینے نے جگہ کو کتنا کشادہ کر دیا تھا۔ اس نے اطمینان سے گاڑی اس ترتیب میں کھڑی کی۔ بریف کیس اٹھایا اور چابی ہوا میں لہراتا، گنگناتا ہوا کمرے کی جانب چل پڑا۔

اپنی میز پر تازہ پھولوں کا گلدستہ دیکھ کر اسے سخت حیرت ہوئی۔ وہ سمجھا شاید نائب قاصد تبدیل ہو گیا ہے اور نیا نائب قاصد یہ پھول لے کر آیا ہے کیونکہ پرانے والے سے تو اسے توقع ہی نہیں تھی۔ اسے سیٹ پر بیٹھے چند لمحے ہی ہوئے تھے کہ نائب قاصد اس کے لیے پانی کا گلاس لے کر حاضر ہوا اور سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر چلا گیا۔ دھلے دھلائے اور استری کیے ہوئے کپڑوں میں بہت بہتر لگ رہا تھا۔

بڑے صاحب کے پی اے نے انٹر کام پر بتایا کہ بڑے صاحب یاد فرما رہے ہیں وہ نوٹ بک پن اور آج کے دن کی Assignment سے متعلقہ ضروری کاغذات لے کر حاضر ہو گیا۔ انہوں نے بڑی شفقت آمیز محبت سے حال پوچھا۔ بیٹھنے کے لیے کہا اور آج کے ضروری معاملات کی باتیں کیں۔ بڑے صاحب کے کمرے سے نکلا تو اسے اپنی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو جانے کے سبب توانائیاں بحال ہوتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

گیارہ بجے تک ہی اس نے آج کی ضروری فائلیں نمٹا دی تھیں۔ کوئی بھی فائل کھولتا ایک نظر دیکھتے ہی وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتا اور پھر اس کا قلم چلنے لگتا۔ پہلے تو ایسا نہیں ہوتا تھا کتنے کتنے دن گزر جاتے تھے مگر وہ فائل کھولتا ہی نہیں تھا پتہ نہیں اسے کیوں یقین ہوتا کہ وہ کیس کو سمجھ ہی نہیں سکے گا اور لوگ بھی تو عجیب طرح کے مسائل لے کر آ جاتے تھے۔ مگر آج جب گیارہ بجے والی چائے آئی تو وہ تمام ضروری معاملات

نمٹا چکا تھا۔

دفتری معاملات میں الجھا ہونے کی وجہ سے اگر کوئی دوست دفتر آ جاتا تو وہ خالی الذہن ہو کر اسے مل ہی نہیں پاتا تھا اور اسی وجہ سے اس کے احباب کی تعداد گھٹتے گھٹتے چند ایک رہ گئی تھی۔ آج ناصر ملنے آیا تو اس نے کرسی سے اٹھ کر اس کا استقبال کیا اسے گلے لگایا بٹھایا۔ حال احوال پوچھا کتنے مہینوں بعد تو وہ آیا تھا۔ پرانی یادوں کا سلسلہ چل نکلا اور مہینوں کا فاصلہ منٹوں میں طے کر کے دونوں آج کے لمحات میں حاضر و ناظر بیٹھے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔

واپسی پر دفتر سے نکلا تو بھی اسے گاڑی نکالنے میں دقت پیش نہیں آئی شیرازی صاحب سڑک کے کنارے پیدل چلتے ہوئے نظر آئے تو بریک لگا دی۔ وہ یقیناً بس اسٹاپ کی طرف جا رہے تھے۔ اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا آئیے ناں شیرازی صاحب بیٹھئے آپ کا گھر میرے راستے میں ہی تو آتا ہے۔ میں ڈراپ کر دوں گا۔

شیرازی صاحب کو ایک لمحے کے لیے تو یقین نہ آیا کہ یہ خواب ہے یا حقیقت مگر جب وہ گاڑی میں بیٹھ چکے گاڑی چل پڑی تو انہیں یقین کرنا پڑا۔ وہ اس خلاف معمول تبدیلی پر غور کرنے لگے گھر تو پچھلے کئی برسوں سے میرا راستے میں ہی تھا اور شروع میں تو مجھے ساتھ بھی لے لیتے تھے۔ پھر پتہ نہیں کب کسی ناگوار ردعمل کے احساس کے بعد مجھے ساتھ لینا چھوڑ دیا تھا۔

اب جو گھر پہنچا تو بیوی کی آنکھیں کھڑکی سے لگی راستہ دیکھتی ہوئی ملیں۔ گاڑی لاک کر رہا تھا سب سے چھوٹے بیٹے نے بانہیں پھیلا دیں۔ آہا پاپا آ گئے------ پاپا آ گئے۔ بیوی نے بریف کیس پکڑا اور اندر داخل ہو گئے۔

اپنا گھر اسے خوشیوں کا گہوارہ لگا۔ اپنی چھت اسے اطمینان کی ضمانت نظر آئی۔ ہاتھ منہ دھو کر باتھ روم سے نکلا تو سب ڈائننگ ٹیبل پر اس کا انتظار کر رہے تھے۔ بیوی نے ڈونگے سے ڈھکن اٹھایا۔ گرم گرم بھاپ نکلی تو یوں لگا جیسے کسی جن کا ہیولہ بنا

ہو اور کہہ رہا ہو "حکم میرے آقا------ دنیا کی اور کونسی نعمت آپ کے قدموں میں ڈھیر کر دوں"

بیوی کے ہاتھوں پر نظر پڑی تو اسے احساس ہوا کتنے برسوں کے نقش جم کر رہ گئے ہیں۔ اس نے پیار سے اس کے چہرے کو دیکھا تو وہ اپنی طرف متوجہ پا کر ایک عجیب سی کیفیت میں چلی گئی۔ جیسے بہت سالوں بعد کسی مرد نے اسے بھرپور توجہ سے دیکھا ہو۔ وہ تو توجہ بھری آنکھوں کی حدت کی لذت ہی بھول گئی تھی۔

ہم کتنے برسوں سے دو اجنبیوں کی طرح ایک ہی چھت تلے رہ رہے تھے۔ اسے پہلے کبھی اس بات کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ اسے تمام تر کوشش کے باوجود بھی یاد نہ آیا کہ وہ آخری مرتبہ کب بیوی بچوں کو لے کر گھر سے باہر نکلا تھا۔ وقت ہی میسر نہ آتا تھا۔ دفتر میں جو فائلیں بچ رہتی تھیں وہ انہیں ساتھ گھر لے آتا اور پھر رات گئے تک ان پر نوٹ لکھتا رہتا۔

کھانا کھانے کے بعد اس نے چھوٹے بیٹے کو گود میں بٹھا کر ڈھیر سارا پیار کر ڈالا۔ اس کی کھلکھلاہٹ نے گھر میں زندگی کی لہر دوڑا دی تھی۔

وہی زندگی جس کے ارد گرد کثافتوں سے آلودہ ہوا لپٹی ہوئی تھی۔ اور وقت کا سورج اپنی شعاعیں پھینک کر اسے اور بھی حدت انگیز کر رہا تھا۔ اس کے گرد صرف کاربن ڈائی آکسائیڈ نہیں تھی۔ اور بھی بے شمار غلاظتیں اور آلودگیاں تھیں۔ جو سورج کی شعاعوں کو اپنے اندر ٹریپ (Trap) کر لیتی تھیں اور اس کا وجود جلتے ہوئے صحرا کی طرح دہکنے لگتا مگر اس کے ٹیرس پر کوئی کھڑکی نہ تھی۔ کہ جسے وہ حسب ضرورت کھول کر ان آلودہ ہواؤں کا اخراج کر سکتا۔ تا کہ کم سے کم حرارت Trap ہوتی۔ اس کے ہاں تو بس عمل اور رد عمل کا فلسفہ تھا اور اسے اس نے تب سے قبول کر لیا ہوا تھا جب سے اس نے نیوٹن کا یہ اصول پڑھا تھا "ہر عمل کا ایک رد عمل ہوتا ہے یہ عمل اور رد عمل باہم برابر لیکن مخالف سمتوں میں ہوتے ہیں۔"

انھی مخالف سمتوں میں سفر کرتے ہوئے اس نے زندگی گزار دی تھی۔ اس سے زیادہ زندگی کا مفہوم اس پر واضح ہی نہیں ہوا تھا۔ دفتر میں گھر، باہر، جہاں بھی ہوتا یہ فلسفہ اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ مگر اس فلسفے کے نتائج میں سوائے شدید اعصابی تھکاوٹ کے اور کچھ بھی اس کے ہاتھ نہ آیا۔

اسے گزرے ہوئے دن یاد آنے لگے۔ گھر دفتر، لوگ، رشتہ دار، ٹریفک، بازاروں کا ہجوم، مہنگائی، خود غرضی، منافقت، اگلے کو کاندھا مار کر اس سے آگے گزر جانے کی خواہش، خود کو دوسروں سے بہتر اور برتر ثابت کرنے کی انتھک دوڑ، شہر کی کم آباد سڑکوں پر لوٹ مار کی وارداتیں، پاؤں سے بم باندھ کر سرمایہ ایک اکاؤنٹ سے دوسرے اکاؤنٹ میں منتقل کروانے کے واقعات، چند روپوں اور جھوٹی انا کے لیے گلا کاٹنے اور گولیوں سے چھلنی کر دینے کی باتیں اور معلوم نہیں اسے کیا کیا کچھ یاد آتا گیا۔ اسے اپنی سانس بند ہوتی ہوئی محسوس ہونے لگی جیسے کوئی اس کا گلا دبانے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کے نرخرے سے عجیب و غریب آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور وہ ان آہنی شکنجوں سے خود کو بچانے کی کوشش میں ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ اپنے ہی گلے سے نکلتی ہوئی آواز سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا سارا بدن پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اعصاب بری طرح کانپ رہے تھے۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے کمرے میں دیکھا مگر خود کو تنہا پا کر ایک عجیب سے خوف کی لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں اُتر گئی۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی سو رہی تھی۔ مگر وہ بالکل اجنبیوں کی طرح اس سے بھی خوف زدہ ہو گیا سائیڈ ٹیبل پر رکھے پانی کے جگ سے اس نے گلاس بھرا اور غٹاغٹ پی گیا۔ ماتھے سے پسینے کے قطرے پونچھے اور تنفس قدرے بحال ہوا تو اس کے کانوں میں آواز پڑی۔ اذان ہو رہی تھی۔ الصلوٰۃ خیرٌ مِنَ النَّوم

(۲۰، فروری ۱۹۹۴ء)

☆☆☆

سڑک کے کنارے

پچھلے کئی دنوں سے مسلسل ایک خواب اسے پریشان کیے ہوئے ہے۔ ایک ہی خواب کا بار بار دکھائی دینا اس قیاس کو تقویت دیتا ہے کہ ایسا ہی یا پھر اس سے ملتا جلتا واقعہ رونما ہونے والا ہے۔

خواب کی نوعیت تو بہت سادہ ہے وہ چیئرنگ کراس سے ریگل کی جانب جارہا ہے۔ تقریباً نصف میں پہنچ کر، پینوراما کے بالکل سامنے اسے ایک بچہ نظر آتا ہے جو فٹ پاتھ سے اتر کر شاہراہ قائداعظم پر اس انداز سے کھڑا ہے۔ کہ جیسے گاڑیوں کی قطار ٹوٹنے کا منتظر ہو، تاکہ سڑک پار کر سکے۔ صبح کے ساڑھے آٹھ بجے کے قریب کا وقت ہے۔ سبھی لوگ اپنے اپنے دفتر پہنچنے کی جلدی میں ہیں۔ وہ بھی اس جلدی میں خاصی رفتار سے گاڑی چلارہا ہے مگر پھر بھی اسے دور سے وہ بچہ نظر آجاتا ہے۔ پہلی نظر دیکھنے پر ہی اسے معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ سڑک پار کرنا چاہتا ہے۔ یہاں کوئی زیبرا کراسنگ نہیں ہے۔ ہو بھی تو کیا فرق پڑتا ہے۔ گاڑیوں پر سوار ممکنہ تیز رفتاری سے گزرتے ہوتے لوگ اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیتے اور گزرتے جاتے ہیں۔

مگر اُس نے اسے دور سے دیکھ لیا ہے۔ مگر یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ اسے رکنا

چاہیے یا باقی لوگوں کی طرح گزر جانا چاہیے۔ چند لمحے لگ جاتے ہیں۔ اور اسی اثناء میں وہ اس جگہ پہنچ جاتا ہے۔ جہاں بچہ کھڑا ہے۔ اور سڑک پار کرنا چاہتا ہے۔ اب بریک لگانا خاصا خطرناک اور بے فائدہ ہو جاتا ہے۔ کہ ایسی صورت میں وہ بہر حال اس حد سے آگے گزر جائے گا۔ بے شک وہ فل بریک لگا بھی لے، تب بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کے بریک لگانے سے خاطر خواہ فائدہ ہو اس کے پیچھے آنے والی گاڑیاں رک جائیں اور وہ میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس دس گیارہ سال کی عمر کا بچہ سڑک پار کرلے۔ سو وہ گزر جاتا ہے۔ مگر ایک خیال جیسے اس کے ذہن میں چپک سا گیا ہو "معلوم نہیں کتنی دیر سے یہ بچہ اس انتظار میں کھڑا ہے کہ گاڑیوں کی قطار ٹوٹے اور وہ سڑک پار کرسکے۔۔۔۔۔۔ معلوم نہیں اور کتنی دیر تک اسے کھڑا رہنا پڑے، کیا پتہ کب کوئی شخص گزرے جو تیز رفتار زندگی سے چند لمحات بچا کر اس بچے کو سڑک پار کرنے کا موقع فراہم کرے۔

بس اسی سوچ میں وہ خواب کی حالت میں کسمساتا ہے اور عجیب سی تھکا دینے والی کیفیت لے کر وہ بیدار ہو جاتا ہے۔ اپنی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کمرے میں نیم اندھیرے میں ڈوبی اشیاء کو دیکھتا ہے۔ اور یہ معلوم کرکے، کہ یہ تو محض ایک خواب تھا۔ وہ عجیب قسم کی بے چینی میں بار بار کروٹ بدلتا ہے۔ اور پھر سو جاتا ہے۔

یہ خواب گذشتہ کئی دنوں سے وہ مسلسل دیکھ رہا تھا۔ اس کی تعبیر کیا ہوگی؟ یا من و عن واقعہ پیش آنے والا تھا۔ وہ دونوں صورتوں کے لیے تیار تھا۔ وہ ذہنی طور پر خود کو اس کے لیے آمادہ کیے ہوئے تھا کہ اگر ایسا واقعہ پیش آگیا، تو چونکہ وہ اس سے پہلے ہی آگاہ تھا۔ اس لیے وہ ہر ممکن کوشش کرے گا کہ وہ گاڑی روک لے، تاکہ اس کے پیچھے آنے والی گاڑیاں بھی رک جائیں اور وہ دس گیارہ سال کا میلے کچیلے کپڑوں والا لڑکا سڑک پار کرسکے۔

جس صبح یہ واقعہ رونما ہوا اس رات بھی اس نے یہ خواب دیکھا تھا۔

چئیرنگ کراس کا اشارہ کھلتے ہی گزرنے والا وہ پہلا شخص تھا۔ اس کے سامنے دور دور تک

کوئی گاڑی نہیں تھی۔ وہ معمول کی رفتار سے گاڑی چلا رہا تھا۔ کہ جب اچانک اس کی نظر پڑی تو اسے شاہراہ قائداعظم کے کنارے فٹ پاتھ پر پینوراما کے سامنے وہ میلے کچیلے کپڑوں والا بچہ کھڑا نظر آیا۔ مگر جتنی دیر میں اس نے بیک مرر میں پیچھے اور پھر سامنے دیکھا اور بریک پر دباؤ بڑھانے کا ارادہ کیا وہ عین اس بچے کے سامنے پہنچ چکا تھا۔

اپنے پیچھے گاڑیوں کا ہجوم دیکھ کر اس نے فوری طور پر اپنا پاؤں کھینچ لیا اور گاڑی کو اسی رفتار سے آگے بڑھنے دیا اور وہ اس بچے کے سامنے سے گزرتا ہی چلا گیا ریگل چوک کا اشارہ بند تھا۔ سو اس کو رکنا پڑا۔ اس نے بیک مرر میں اس لڑکے کو دیکھنے کی کوشش کی مگر آئینے میں سوائے گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کی قطاروں کے اور کچھ نظر نہ آسکا۔

دفتر پہنچا تو طبیعت بہت بوجھل تھی۔ عجیب سی بے زاری اس کے اعصاب پر مسلط تھی۔ زیادہ الجھن اس وجہ سے تھی کہ معلوم ہونے اور چاہنے کے باوجود بھی وہ ایسا نہ کر سکا جیسے اس کا پہلے سے کیا ہوا فیصلہ تھا۔ اور اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اسے کسی اور کے سہارے کی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ کوئی اور اس راہ میں حائل بھی نہ تھا۔ مگر پھر بھی ویسا ہی ہو گیا تھا جیسا وہ گذشتہ کئی دنوں سے خواب میں دیکھ رہا تھا۔

دس گیارہ سال کی عمر کے میلے کچیلے کپڑوں والے اس لڑکے کا عین اسی جگہ صبح ساڑھے آٹھ بجے کے قریب اس طرح مل جانا اس کے لیے حیران کن تھا۔ دفتر میں بیٹھا وہ عجیب انداز سے اس واقعہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے ابھی تک نہ تو اپنے خواب کا اور نہ ہی آج صبح کے واقعہ کا کسی سے تذکرہ کیا تھا اس کی سوچ کا دھاگا الجھتا ہی جا رہا تھا۔

یہ لڑکا سڑک پار کر کے کہاں جانا چاہتا تھا۔ سامنے تو پینوراما شاپنگ سنٹر تھا۔ جہاں ابھی تک دکانیں کھلی نہیں تھیں۔ ویسے بھی اس عمر کے لڑکے کا کسی دکان پر سیلزمین کے طور پر کام کرنا بعید از قیاس تھا۔ تو کیا کوئی صفائی وغیرہ کا کام کرتا تھا۔ بظاہر ایسا بھی نہیں لگ رہا تھا۔ کہ ابھی اس کی عمر ایسی نہ تھی کہ وہ یہ کام بہ احسن طریق سر انجام دیتا۔

تو یقیناً وہ کسی ٹی سٹال پر کام کرتا ہو گا۔ شہر میں اس عمر کے بے شمار لڑکے یہی کام کرتے تھے چائے لے جاتے تھے اور پھر خالی برتن اور پیسے لے آتے تھے۔ مگر ابھی تو پینورااما کی دکانیں کھلنا شروع ہی نہیں ہوئی تھیں۔۔۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ دودھ والا جلدی آتا ہو، یا پھر شاید ٹی سٹال کی صفائی وغیرہ بھی اسی کے ذمے ہو۔ بہر حال یہ بات دل کو زیادہ صحیح لگ رہی تھی۔

کیا عمر ہو گی؟ یہی کچھ دس گیارہ سال۔۔۔۔۔۔ اس نے دوبارہ سوچا۔ اس عمر کے بچے تو پرائمری پاس کر کے ہائی سکول جانے کی تیاریوں میں ہوتے ہیں۔ یا جا چکے ہوتے ہیں۔ یہ ایک جیسے یونیفارم پہنے ہوئے سینکڑوں بچے جب ایک جگہ اکٹھے نظر آتے ہیں۔ تو یوں لگتا ہے جیسے وقت واپس لوٹ آیا ہو، اور لمحے منجمد ہو گئے ہوں۔ بہت پرانی بات تھی مگر یوں لگ رہا تھا جیسے کل کی بات تھی، وہ پتہ نہیں اور کہاں کہاں مارا مارا پھرتا کہ اس کا اسسٹنٹ کمرے میں داخل ہوا اور خیال کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

سَر۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ میرے بچے کو۔۔۔۔۔۔۔۔

لفظ اس کے منہ میں ہی تھے کہ وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا، ہاں کیا ہوا تمہارے بچے کو۔۔۔۔۔۔ اس نے سڑک تو پار کر لی تھی ناں۔۔۔۔۔۔۔ وہ خیریت سے تو ہے؟ مگر اتنی صبح ہی صبح تم نے اسے کہاں بھیجا تھا۔؟

جی۔۔۔۔۔ سَر آپ کیا کہہ رہے ہیں میں سمجھا نہیں؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔۔۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں۔۔۔۔۔۔۔ میں تو کچھ بھی نہیں کہہ رہا تھا۔ کیا میں نے کچھ کہا؟

سَر آپ کسی بچے کا ذکر کر رہے تھے اور پوچھ رہے تھے کہ اس نے سڑک پار کر لی یا نہیں۔

اچھا۔۔۔۔۔۔۔ یہ سب میں نے کہا؟۔۔۔۔۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔۔۔۔ کمال ہے۔ میں نے تو یہ سب اپنے آپ سے کہا تھا۔ تم نے کیسے سن لیا؟ تم سے تو میں نے کچھ

نہیں کہا؟
تو کیا میں اپنے آپ سے اونچی آواز میں کچھ کہہ رہا تھا؟
اسٹنٹ کو بات سمجھ نہیں آئی۔ اور وہ دوبارہ بولا۔۔۔۔۔۔ سر، " میرے بچے کو اسکول دیر ہو رہی تھی۔ میں اسے اسکول چھوڑنے چلا گیا بس نکل گئی تھی۔ اس لیے مجھے بھی دیر ہو گئی، معافی چاہتا ہوں۔
ہاں ٹھیک ہے کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔ دیر ہو ہی جاتی ہے۔ ٹریفک بھی تو بہت زیادہ ہے ناں ظاہر ہے سڑک پار کرنے کے لیے بھی کئی کئی گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ گاڑیوں کی قطار ہی نہیں ٹوٹتی۔
مجھے اجازت ہے سر۔۔۔۔۔ اسٹنٹ کچھ نہ سمجھتے ہوئے چپکے سے کمرے سے باہر نکل گیا سارا دن وہ اسی طرح کے خیالات میں کھویا رہا۔ معلوم نہیں سویا رہا کہ جاگتا رہا، بس دھیان آ جا کر اس بچے پر ٹک جاتا تھا۔ پتہ نہیں اس نے سڑک پار کر لی ہو گی یا نہیں۔ کہیں وہ ابھی تک وہیں نہ کھڑا ہو؟ کہیں وہ گاڑیوں کی قطار ٹوٹنے سے ناامید ہو کر واپس نہ چلا گیا ہو۔ یا پھر کہیں جلدی میں وہ کسی گاڑی کے نیچے نہ آ گیا ہو۔۔۔۔۔۔
اس خیال کے آتے ہی اس کا پورا بدن پسینے میں نہا گیا۔ دن میں کئی بار اسے یہ خیال آیا اور کئی بار اس کا بدن پسینے میں شرابور ہوا۔ ماتھے پر قطرے چمکنے لگے۔ کئی بار اس نے سوچا کہ چل کے دیکھ آئے۔ شاید تب ہی اطمینان کی کوئی صورت بنے۔
مگر اس کی ٹانگیں اتنی بے جان ہو چکی تھیں کہ وہ محض ایسا سوچ سکا، عملی طور پر ایسا کر نہ سکا۔ ایک انجانا سا خوف اسے اس سے روکے ہوئے تھا۔
دفتر سے واپسی پر وہ خاصی کم رفتار سے گاڑی چلا رہا تھا۔ جوں جوں پینورما شاپنگ سنٹر نزدیک آ رہا تھا اس کے دل کی دھڑکن تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ کیا معلوم وہ ابھی وہیں کھڑا ہو؟ دور سے اسے اس جگہ پر لوگوں کا ایک ہجوم نظر آیا۔ اس کے بعد اسے معلوم نہیں کہ کب اس نے گاڑی کھڑی کی کب وہ گاڑی سے باہر نکلا اور تقریباً دوڑتا ہوا ہجوم

کو چیرتا ہوا اس کے عین مرکز میں پہنچا جہاں ایک موٹر سائیکل سوار گرا پڑا تھا۔ اور اس کے بازو سے خون رِس رہا تھا۔ موٹر سائیکل کا اگلا پہیہ ٹیڑھا ہو کر تقریباً ناقابل استعمال ہو چکا تھا۔

وہ وہ نہیں تھا، اتنا اطمینان کر لینے کے بعد اس کی سانس کی رفتار نارمل ہونے لگی۔ تو اسے معلوم ہوا کہ ایک بچے کو جو کہ سڑک عبور کر رہا تھا۔ انتہائی تیز رفتاری میں بریک لگاتے ہوئے موٹر سائیکل سوار اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور گر پڑا۔

بچہ بھی وہیں کھڑا تھا، مگر یہ بچہ وہ نہیں تھا۔ یہ تو صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس کسی خوشحال گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ اور اطمینان سے چیونگم چبا رہا تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

گھر میں بھی وہ رات گئے تک کھویا کھویا رہا۔ اس کی بیوی نے دو ایک مرتبہ اسے کریدا بھی مگر وہ ٹال مٹول کر گیا۔

اگلی صبح وہ بیدار ہوا۔ اس نے ناشتہ کیا اور وقت سے ذرا پہلے ہی دفتر روانہ ہو گیا۔ گاڑی کی رفتار خاصی معتدل تھی۔ چیئرنگ کراس گزرنے کے بعد اس نے دور دور تک نظر دوڑائی۔ مگر وہ بچہ کہیں نظر نہ آیا۔ پس منظر میں صرف دکانیں تھیں جو ابھی بند پڑی تھیں۔ پینوراما سنٹر کے سامنے پہنچ کر اس نے گاڑی کی رفتار خاصی سُست کر لی۔ مگر وہاں کوئی تھا ہی نہیں کہ جسے سڑک پار کرنا ہوتی۔ واپسی پر بھی ایسا ہی ہوا۔

پھر کئی دن اور کئی مہینے بلکہ کئی سال گزر گئے۔ اسے وہ میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس دس گیارہ سال کا بچہ نظر نہ آیا۔ مگر ایک مستقل خلش اس تمام عرصہ میں اس کے ہمراہ رہی۔ اسے وہ خواب تو دوبارہ نظر نہ آیا مگر اس کا خیال ہمیشہ اس کے ساتھ ساتھ محوِ سفر رہا، جو مستقل طور پر اضطراب اور بے چینی کی وجہ بنا رہا۔

اور پھر کئی سالوں کے بعد اسی جگہ سے گزرتے ہوئے اسے ایک بیس بائیس سالہ

نوجوان نظر آیا۔ جو پینورا ما سنٹر کے سامنے، شاہراہ قائد اعظم پر فٹ پاتھ سے نیچے سڑک پر کھڑا تھا اور گاڑیوں کی قطار ٹوٹنے کا منتظر تھا۔ اس نے دور سے ہی اسے دیکھ لیا تھا۔ اس نے بریک پر دباؤ ہلکا ہلکا بڑھانا شروع کر دیا۔ اور عین اس جگہ سے ذرا پہلے کار تھی کھڑی کر دی۔ کہ نوجوان سڑک پار کر سکے۔ نوجوان نے سڑک پا کر لی۔ تو اس نے اطمینان سے ایکسلریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ ایک عجیب سا اطمینان تھا جس نے اسے ہلکا پھلکا کر دیا تھا۔ اس کی برسوں کی خلش جیسے دور ہو گئی تھی۔ اس نے یہ فرض کر لیا تھا کہ کئی برس پہلے دس گیارہ سال کا جو بچہ میلے کچیلے کپڑے پہنے پینورا ما سنٹر کے سامنے سڑک پار کرنا چاہتا تھا وہ یہی نوجوان تھا۔

(۱۶ - اگست ۱۹۹۴ء)

☆☆☆

گلاس وال

اخبار کے نیوز سیکشن کے جس گلاس کیبن میں وہ بیٹھا ہے ملٹی سٹوری بلڈنگ کے پانچویں فلور پر واقع ہے اور اس کیبن کے تین اطراف گلاس وال ہے جبکہ چوتھی سمت ایک بڑی کھڑکی کھلتی ہے جس میں دور دور تک شہر کے مختلف علاقے نظر آتے ہیں۔ دو دو چار چار مرلوں پر مشتمل گھروں سے لے کر کئی کئی کنال کے بنگلوں کے علاوہ کثیر منزلہ عمارتیں حدِ نگاہ تک کھڑی نظر آتی ہیں۔ دن کو تو کوئی خاص منظر نہیں ہوتا البتہ رات کو روشنیوں میں لپٹی عمارتیں عجیب طرح کے احساسات لیے ہوتی ہیں۔

گلاس وال کے اس کیبن سے نیوز سیکشن کے دوسرے کیبنوں کے علاوہ نیوز ہال میں کام کرتے ہوئے کمپیوٹر روبوٹ بھی دیکھے جا سکتے ہیں وہ ان انسانوں کو روبوٹ اس لیے کہتا تھا کہ اسے کبھی ان کے چہروں پر کوئی خوشی، غمی، افسردگی، جوش--- کوئی تاثر نظر نہیں آیا بڑی سے بڑی خبر ہو سبھی اپنے کام میں محو رہتے ہیں کسی قسم کے جذباتی ردعمل سے بے نیاز، ہر لحہ مصروفِ کار نظر آنے والے انسانوں کو وہ روبوٹ نہ کہتا تو کیا کہتا۔

اس کے کیبن میں ٹک ٹک--- ٹک ٹک--- مسلسل آواز--- خبریں--- وہ خبریں جو دوسرے شہروں سے آتی تھیں۔ خود بخود ٹائپ ہو کر پیپر پر منتقل ہوتی

رہتی تھیں اور وہ تھوڑی دیر کے بعد ان خود کار ٹائپ رائٹروں سے نکلے ہوئے کاغذ اکٹھے کرتا اور پھر انہیں متعلقہ سیکشن میں بھیج دیتا، کم و بیش یہی اس کی ذمہ داری تھی اور شاید اسی وجہ سے اسے کچھ لمحے میسر آجاتے اور وہ کبھی کھڑکی سے باہر سوئے ہوئے شہر کو دیکھ لیتا، اور کبھی اس کی نگاہ کمپیوٹر ڈیسک پر مصروف روبوٹس پر پڑ جاتی اور کوئی نہ کوئی خیال، یاد رہ جانے والی کوئی بات سرک کر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا جاتی اور اس طرح وقت گزرتا رہتا۔

نیوز سیکشن کے ان کیبنوں کا مقصد یہی تھا کہ بصری رابطہ رہے مگر سمعی تعلق قائم نہ ہو۔ تاکہ کسی بھی روبوٹ کی پراگرس پر اثر نہ پڑے۔ مگر کئی سالوں سے اسی طرح کام کرنے والوں کی عجیب طرح کی سائیکی بن گئی تھی۔ بعض اوقات تو اسے جذبات سے عاری چہروں سے وحشت ہونے لگتی مگر وہ کیا کر سکتا تھا۔ نیوز سیکشن میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

اس نے خود کار ٹائپ رائٹر سے نکلنے والا کاغذوں کا پلندہ اٹھا کر ابھی ایک طرف رکھا ہی تھا کہ اس کی نظر کمپیوٹر تین کے روبوٹ پر پڑی۔ وہ خاصی تکلیف دہ کیفیت سے گزر رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات کسی شدید ذہنی تناؤ کی عکاسی کر رہے تھے اچانک اس کی چیخ ابھری، مگر اس کے آس پاس بیٹھے دیگر روبوٹس نے اس کا کوئی نوٹس ہی نہ لیا۔ جیسے ان کا باہمی سمعی رابطہ قائم ہی نہ ہو، یا پھر جیسے ہر کوئی اپنی مصروفیت کی دلدل میں سر سے پاؤں تک دھنسا ہوا ہے ظاہر ہے ایسی صورت حال میں کوئی آواز سننا ناممکن سی بات ہوگی۔ کمپیوٹر تین کا روبوٹ چیخا---- "نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا--- یہ ممکن ہی نہیں" ----- وہ خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

شام جب وہ آفس آ رہا تھا، تو بازار اسی طرح بارونق اور لوگ حسبِ معمول خریداری میں مصروف تھے--- پُرجوش نوجوان، خوش بچے--- مصروف خواتین--- قائل کرتے ہوئے دوکاندار--- سب، کچھ ویسے ہی تھا اور وہ دہی بھلے والا--- آج تو بہت ہی

رش تھا اس کے پاس--- گاڑیوں کی قطاریں بھی ویسی ہی تھیں--- انار کلی بازار میں داخل ہونے سے پہلے اس نے دیکھا تھا کہ اسٹیشنری سٹور پر بھی معمول کے مطابق رش تھا، مگر اس خبر کے مطابق ٹھیک چار بج کر پچپن منٹ پر دھماکہ ہوا تھا، بم کسی خالی ڈبے میں رکھا گیا تھا، یعنی اس کے آنے سے صرف بارہ منٹ بعد--- اور اب سڑک پر بہنے والا خون جم کر سیاہ ہو چکا تھا۔ بم دھماکے میں لوگوں کے اڑ جانے والے چیتھڑے اکٹھے کیے جا رہے تھے۔ کئی ایک ایسے تھے جن کے جسم کے اعضا پورے نہیں مل رہے تھے، کئی ایک کی شناخت ناممکن ہو رہی تھی چند ایک ایسے بھی تھے جو بال بال بچ گئے تھے، اور انھوں نے آنکھوں دیکھی صورتِ حال بیان کی تھی۔"

کمپیوٹر تین کے روبوٹ نے ساری خبر باآواز بلند پڑھنا شروع کر دی--- مگر یہ کیا کسی نے بھی تو توجہ نہیں دی۔ جیسے سب بہرے ہوں۔

گلاس کیبن میں بیٹھا وہ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اس نے کافی ضبط کیا۔ مگر نہ رہ سکا اور گلاس کیبن سے باہر نکل آیا، اور کمپیوٹر تین کے آپریٹر کی طرف بڑھنے لگا، قریب پہنچ کر اس نے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھا، مگر وہاں تو مسلسل خاموشی اور چپ کا راج تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

اسے اپنے کانوں میں گونجتی سیٹیوں کی آوازیں سنائی دیں، شور بڑھتا جا رہا تھا، وہ کوئی بات کیے بغیر واپس اپنے کیبن میں آ گیا۔ ٹک ٹک--- ٹک ٹک--- ٹک--- وہی ایک ہی آواز--- کان جس کو سن سن کر عادی ہو گئے تھے اور اب تو جیسے اعصاب میں تناؤ پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ ابتدائی دنوں میں اسے یوں لگتا تھا جیسے یہ ٹک ٹک اب بند ہوئی کہ اب بند ہوئی--- اور اس انتظار میں اس کے اعصاب تناؤ کا شکار ہوتے رہتے تھے مگر پھر آہستہ آہستہ وہ اس کا عادی ہو گیا۔ آواز آتی رہے تو وقت کے گزرنے کا احساس ہوتا رہتا تھا اپنے بیڈروم میں ٹائم پیس کی ٹک ٹک میں بھی اسے یہی ٹک ٹک کی آواز سنائی دیتی تھی۔

اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا، شہر پُرسکون نیند کی حالت میں تھا۔ شام ہونے والے دھماکے کا کہیں احساس تک نہیں تھا۔ اسے خود اس حقیقت پر شائبہ ہونے لگا--- ہو سکتا ہے میرا وہم ہو--- وہ جتنا سوچ رہا تھا اسے یقین ہوتا جا رہا تھا۔ ظاہر ہے صبح بیدار ہونے والے اخبار میں اس دھماکے کی تفصیل پڑھیں گے تو وہ نہیں مانیں گے اور اخبار کے جھوٹا ہونے کا اعلان کر دیں گے۔ چشم دید گواہ بھی اتنے سہم چکے ہوں گے کہ ان کی یادداشت ان کا ساتھ چھوڑ دے گی اور ویسے بھی ایک اَن دیکھا اَن چھوا خوف خود انہیں اس طرح کی گفتگو سے روکے گا۔

مگر کاغذ پر لکھ دیئے جانے والے حروف آنے والے وقت کا سب سے بڑا سچ بن کر زندہ رہتے ہیں اور یہی یقین تھا۔ جس کی وجہ سے وہ زندگی کی بے معنویت کا شکار نہ ہوتا تھا اور یہ نوکری جاری رکھے ہوئے تھا۔

کمپیوٹر سات کے روبوٹ نے ایک بھرپور انگڑائی لی، سامنے رکھے ہوئے کاغذات کی تعداد کو گِنا، کام کا اندازہ کر لینے کے بعد اس نے گھڑی کی طرف دیکھا اور اس کی انگلیاں کی بورڈ پر اور بھی تیزی سے چلنے لگیں--- ایک خاندان کے سات افراد کی اجتماعی خود کشی--- تفصیلات کے مطابق ایک تنگ دست شخص نے بیمار بیوی، مفلوج ماں اور یرقان زدہ بچوں سمیت خود کشی کر لی اور پتہ اس وقت چلا جب ہمسائیوں کے گھر میں تعفن زدہ لاشوں کی بُو گھس آئی۔

روبوٹ کی آنکھ سے ٹپکنے والے آنسوؤں نے سامنے پڑے کاغذات کو بھگو دیا۔ لفظ پھیلنے لگے، لفظ جو لکھے جانے کے بعد بھی ہمیشہ رہ جانے والے سچ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، نمکین پانی کے سامنے اپنا تشخص قائم نہ رکھ سکے، اور پھیلنے لگے۔

وہ گلاس کیبن سے باہر نکل آیا مگر سیدھا کمپیوٹر سات کے روبوٹ کی جانب نہیں گیا اس حالت میں بھیگی آنکھوں کے ساتھ اس کے مقابل نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ پتا نہیں کیوں؟ رونے والوں کے ساتھ وہ بھی رو دینے والوں میں سے تھا اور یہی بات اس

کے لیے بزدلی کا ٹائیٹل ملنے کا سبب بنی تھی مگر اس کا ایمان تھا کہ رونے والے دل کے بہت اچھے ہوتے ہیں۔

وہ ایک لمبا چکر کاٹ کر جب کمپیوٹر سات کے روبوٹ کے پاس پہنچا۔ تو وہ حسبِ معمول اپنے کام میں مصروف تھا۔ اس نے بات کرنے کی کوشش کی مگر کمپیوٹر سات کا روبوٹ اس کی آواز نہ سن سکا۔ اسی لیے تو اس کے بات کرنے کے بعد بھی روبوٹ کے چہرے پر کوئی تاثر نہ ابھرا تھا۔ اسے پھر شائبہ ہو گیا۔ شاید گلاس کیبن سے اس نے غلط اندازہ لگا لیا تھا یہاں تو سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔

وہ پلٹا تو اس کی نظر کمپیوٹر پانچ کے روبوٹ کی خالی کرسی پر پڑی تو اسے یاد آیا۔۔۔ کمپیوٹر پانچ کا روبوٹ ابھی نہیں آیا تھا۔ البتہ کچھ دیر پہلے اس کی اطلاع آئی تھی کہ اگر وہ دس بجے تک آ گیا تو ٹھیک ورنہ وہ نہیں آ سکے گا اور اس کی چھٹی کی درخواست منظور کر لی جائے جو اس نے اپنے دراز میں رکھ چھوڑی تھی۔

کمپیوٹر پانچ کا روبوٹ حال ہی میں شادی کے بندھن میں باندھا گیا تھا تب سے اس کی توجہ کام پر کم اور منکوحہ کی باتیں بیان کرنے پر زیادہ صرف ہونے لگی تھی۔ اس بات کو محسوس تو سب نے کیا تھا مگر کسی کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں اُبھرا تھا۔

شادی کے پہلے ایک مہینے تک تو وہ اپنی منکوحہ کی خوبصورتی اور اچھائیوں کے قصے بیان کر کے خود کو یقین دلاتا رہا اسے پرابلم یہ تھا کہ وہ محبوبہ جس کے لیے اس نے کتنی ہی ملازمتوں سے برطرفی قبول کی تھی اور جب وقت آیا تھا تو اس نے اپنی قریبی رشتہ دار بچپن کی منگیتر سے شادی کر لی تھی گاؤں سے شہر آ کر اور خصوصاً صحافت سے وابستہ ہو کر اس کے بہت سے اطوار بدل گئے تھے مگر ایک چیز نہ بدلی تھی۔ اور وہ اس کا اندر تھا۔ اس نے آنکھوں سے کچھ اندر اترنے دیا ہوتا تو مستقل تبدیلی آتی یہ اس کا ہی حال نہ تھا یہاں سب روبوٹس ہی ایسے تھے۔ تبدیلیوں کو ظاہری سطح پر قبول کرنے والے۔ تو پھر ایسے لوگوں کے الفاظ میں اثر پذیری کہاں سے آئے انقلاب کہاں سے

اُٹھے۔

وہ یہ سب سوچتا ہوا دوبارہ گلاس کیبن میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے خود کار ٹائپ رائٹر سے لکھی جانے والی خبروں والے کاغذات کا بنڈل باندھا اور نیوز سیکشن کے متعلقہ روبوٹ کو بھجوا دیا۔ ٹک ٹک --- ٹک ٹک چل رہی تھی مگر آج تو جیسے اس کے اندر کی سوئی کہیں اٹک گئی تھی وقت گزر رہا تھا --- ٹک --- ٹک --- مگر گھڑی کی سوئیاں جیسے ایک ہندسے پر ٹھہر گئیں تھیں۔

اس نے چائے منگوائی۔ گرم گرم پانی کے دو تین گھونٹ حلق سے نیچے اترے تو اس نے اسٹول پر بیٹھ کر کمر پیچھے ٹکا دی اور آنکھیں بند کر لیں۔ مگر کان تو کھلے ہوئے تھے سن رہے تھے ٹک ٹک --- ٹک ٹک

اس کا دھیان چار چار کنال کے بڑے بڑے بنگلوں کی طرف چلا گیا۔ جن کے فرنٹ لان بھی بڑے ہوتے ہیں اور ان میں اگنے والی گھاس بھی زیادہ سرسبز و شاداب ہوتی ہے۔ بالکل مخملیں فرش کی طرح بچھی ہوئی گھاس --- اس نے صرف اخبار میں شائع ہونے والی کہانیوں میں اس کا تذکرہ پڑھا تھا۔ پتہ نہیں کب؟ --- وہ چونک اٹھا --- شاید کوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کمپیوٹر چار کا روبوٹ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا "قدرت کی طرف سے ہونے والی یہ ناانصافی قطعی ناقابلِ برداشت ہے۔ یہ تنگ و تاریک گھروں میں رہنے والے بمشکل تمام زمین پر لیٹنے کے لیے جگہ تلاش کر پاتے ہیں اور اتنے بڑے بڑے بنگلوں میں رہنے والے سامانِ آرائش سے بڑے بڑے کمرے بھر لیتے ہیں کہ گھر خالی نہ لگے مگر گھروں کی زندگی تو انسانوں سے مشروط ہے بے جان اشیا انسانوں کی کمی پوری نہیں کر سکتی --- اے خدا یہ ظلم ہے بڑے بڑے لانوں میں دھوپ بھی زیادہ چمکتی ہے جبکہ ہمارے تنگ و تاریک مکانوں کی چھتوں اور صحنوں کے حصے میں دھوپ بھی کم آتی ہے۔" --- کمپیوٹر چار کے روبوٹ کی چیخ آہستہ آہستہ کم ہوتی گئی حتیٰ کہ وہ بلکنے لگا۔

وہ ایک مرتبہ پھر گلاس کیبن سے باہر نکلا اس نے دور ہی سے دیکھ لیا کہ کمپیوٹر چار کا روبوٹ اپنے سپاٹ چہرے کے ساتھ اپنے کام میں جتا ہوا ہے اور گرد و پیش سے بے نیاز --- اپنی انگلیاں کی بورڈ پر چلا رہا ہے۔

''تو کیا یہ بھی میرا واہمہ تھا'' --- وہ گلاس کیبن کا دروازہ کھولتے ہوئے اندر داخل ہوتا ہے، ڈور کلوزر سے دروازہ خود ہی بند ہو جاتا ہے اور ایک مرتبہ پھر اس کا نیوز سیکشن میں بیٹھے روبوٹس سے بصری رابطہ قائم ہو جاتا ہے اور سمعی تعلق ختم ہو جاتا ہے اس کے کانوں میں ٹک ٹک --- ٹک ٹک --- مسلسل آتی ہوئی آواز ---

وہ کھڑکی سے باہر جھانکتا ہے۔ پانچویں فلور سے سوئے ہوئے شہر کی مختلف طرز کی عمارتیں کچھ روشنی میں کچھ اندھیرے میں لپٹی ہوئی نظر آتی ہیں۔

وہ کچھ دیر کے لیے اپنا سر کرسی کی پشت پر ٹکا دیتا ہے اور آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد --- خود کار ٹائپ رائٹر کی ٹک ٹک --- بند ہو جاتی ہے۔ وہ آنکھیں کھول دیتا ہے گلاس وال کی دوسری طرف کام کرنے والے روبوٹس نے اپنے ہاتھ روک دیئے ہیں۔ کمپیوٹر روم میں ہلکی پھلکی حرکت پیدا ہو گئی ہے جیسے آہستہ آہستہ زندگی واپس لوٹ رہی ہو۔

گاڑی تیار ہے --- ڈرائیور آخری ہارن بجاتا ہے۔ اس سے قبل سب روبوٹس گاڑی میں بیٹھ چکے ہیں اور وہ بھی ایک طرف کونے میں بیٹھا اونگھ رہا ہے

پَو پھوٹنے سے ذرا دیر پہلے کا وقت ہے سڑکوں پر زندگی کے آثار پیدا ہو چکے ہیں ''شہر بیدار ہو رہا ہے۔'' --- وہ سوچتا ہے --- ''مگر وہ نیند کی آغوش میں اترتے جا رہے ہیں لحہ بہ لحہ --- دم بدم --- جہاں نہ تو ٹک ٹک کی آواز سنائی دیتی ہے، اور نہ ہی روبوٹس نظر آتے ہیں نہ گلاس وال ہے۔ البتہ ایک کھڑکی ہے جو بہت بڑے لان کی طرف کھلتی ہے۔ جہاں سبزے کا مخملیں فرش زمین پر بچھا ہوا ہے۔ ہاتھ ہلاتے ہوئے اپنی طرف بلاتے ہوئے ہرے اشجار ہیں۔ جو ہوا چلے تو جھولا جھلاتے ہیں نہ چلے تو ساکن

رہتے ہیں جو خزاں میں تہی دست ہو جاتے ہیں۔ بہار میں پُربہار ہوتے ہیں۔ جہاں زندگی ہنستی کھیلتی نظر آتی ہے۔ محسوس ہوتی ہے، سنائی دیتی ہے۔ جہاں لکھے جانے والے حروف نہیں بلکہ سنی جانے والی آواز سچائی کی علامت بن کر ابھرتی ہے۔

(فروری ۱۹۹۳ء)

☆☆☆

خوابوں کی گِرہ میں پڑی لڑکی

اسے خواب پسند تھے۔ مگر وہ جاگتی آنکھوں خواب دیکھنے والی لڑکی نہیں تھی۔ مگر اس کا یہ مطلب بھی قطعاً نہیں کہ وہ محض خوابوں کی سلطنت کی شہزادی تھی۔ وہ تکلیف دہ حد تک حقیقت پسند لڑکی تھی بلکہ وہ خوابوں میں بھی حقیقت پسند تھی۔ اور خواب محض عارضی فراریا نا آسودہ خواہشوں کی تکمیل کیلئے نہیں دیکھتی تھی۔ بلکہ خواب اس کی شخصیت کا لازمی حصہ بن گئے تھے۔ اور کچھ وقت گزرنے کے بعد تو وہ مجھے خوابوں کے بغیر ادھوری لگنے لگتی تھی۔

ڈیپارٹمنٹ آنے کا ہمارا وقت کم و بیش ایک ہی تھا۔ اور آتے ہی میں اسے دیکھ کر بتا سکتا تھا۔ کہ آج اس نے خواب دیکھا یا نہیں اور اگر خواب دیکھا تو وہ کس قسم کا ہو گا۔ ایک عجیب کشش آمیز چمک ہوتی تھی اسکی آنکھوں میں۔ سردیوں میں تو عموماً ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر ٹیرس پر چلے جاتے تھے۔ اور گرمیوں میں ہمارا پڑاؤ وسطی صحن کے شمالی کونے میں پڑے ہوئے دو ٹانگوں والے بنچ پر ہوتا۔ کیونکہ دو ٹانگیں اس کی ٹوٹ چکی تھیں۔ اور ہم نے ہی اپنی ضرورت کیلئے چند اینٹیں جوڑ کر اس بنچ کو سہارا دے کر کھڑا رکھا ہوا تھا۔

آہستہ آہستہ ہم ایک دوسرے کو اتنا سمجھنے لگ گئے کہ میں اسے دیکھ کر ہی بتا

سکتا تھا کہ آج اس نے کس قسم کا خواب دیکھا ہو گا۔ جس روز اس نے پاؤں میں پازیب پہنی ہوتی۔ اس روز اس کے خواب میں میں موجود ہوتا۔ وہ پازیب کو پاؤں کی زیبائش کے لئے نہیں پہنتی تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس کے پاؤں اتنے خوبصورت تھے۔ کہ اسے اس کی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ یہ ایک طرح سے اس کے نزدیک خود کو دوسرے سے منسوب کرنے کے اعتراف کا اظہار تھا۔

جس روز اس نے کانوں میں لہراتے ہوئے جھمکے پہن رکھے ہوتے۔ اس روز وہ بالوں کو ربن سے باندھ کر آتی تھی۔ اور میں سمجھ جاتا کہ آج اس نے بہت مسرت انگیز خواب دیکھا ہے۔ اور سارا دن وہ خوشگوار طرز میں گنگناتی رہے گی۔ اور بالوں کو بھی اسی لیے ربن سے باندھ کر آتی تھی۔ کہ اس روز بالوں کے الجھنے اور بکھرنے کا زیادہ چانس ہوتا تھا۔ تمام دن وہ ہواؤں کے دوش اڑتی رہتی۔ اس روز اسے جو کلاس فیلو برے لگتے تھے ان کے ساتھ بھی وہ بڑی خوش دلی سے بات کرتی۔

عجیب لڑکی تھی۔ پل میں تولہ پل میں ماشہ۔ کسی کا ایک جملہ پسند آگیا۔ اپنے دل سے اس کے بارے میں پرانی تلخی بھی نکال پھینکتی۔ کسی نے غیر متوقع طور پر کوئی ناخوشگوار جملہ کہہ دیا پل بھر میں یوں جھلس جاتی جیسے جون کی گرم دوپہر میں دو کوس پیدل چل کر آئی ہو۔

میں نے کہا ناں۔ کہ خواب اس کی شخصیت کا لازمی حصہ تھے۔ میں تو اس کے لباس کا رنگ دیکھ کر بتا سکتا تھا۔ کہ آج اس نے کس طرح کا خواب دیکھا ہو گا۔ پھر بھی صبح ڈیپارٹمنٹ آنے پر ہماری پہلی مصروفیت یہی ہوتی۔ کہ میں اس سے خواب کی پوری جزئیات سنتا۔ اور آخر میں وہ بڑا مشکل سوال کرتی۔ کہ میرے خیال میں اس کی تعبیر کیا ہو گی۔ پہلے پہل تو مجھے بڑی مشکل سے گزرنا پڑتا۔ مگر جلد ہی مجھے پتہ چل گیا کہ وہ دراصل مجھ سے تعبیر نہیں پوچھ رہی ہوتی بلکہ اپنی تعبیر سنانے کیلئے میدان ہموار کر رہی ہوتی تھی۔

بعض اوقات تو وہ کئی کئی دن تعبیر کی تلاش میں ہلکان ہوتی رہتی۔ اور جب تک کوئی مفروضہ بنا نہ لیتی۔ اس کا خواب مکمل نہ ہوتا تھا۔

میں نے کہا ناں کہ اس کے لباس کا انتخاب اس کے خواب کا عکس میری آنکھوں میں لہرا دیتا تھا۔ ایک روز ہم سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ کہ میری نظر سامنے صحن میں اُگی ہلکے جامنی رنگ کی کلیوں پر پڑی۔ جوں جوں زینے اوپر چڑھ رہے تھے۔ کلیاں سامنے آتی جا رہی تھیں۔ میں نے اس طرف اشارہ کیا تو وہ ہنس پڑی مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔ پھر کئی دن گزر گئے۔ ایک روز میں صبح ہی صبح ڈیپارٹمنٹ آیا تو سیدھا لائبریری گھس گیا۔ تھوڑی دیر بعد باہر نکلا تو سیڑھیاں اترتے ہوئے میری نظر اس کے پاؤں پر پڑی۔ اور پھر ہلکے جامنی رنگ کی پھولدار شلوار اور قمیض۔۔۔۔۔۔ جو زینہ اترتے ہوئے نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔ زینہ اتر چکا تو وہ سامنے کھڑی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور دل میں سوچا۔ زینہ چڑھتے ہوئے ان جامنی رنگ کی کلیوں سے جو لطف آتا تھا۔ میں صرف اس سے آشنا تھا۔ آج زینہ اترتے ہوئے ان کو دیکھا ہے۔ تو احساس ہوا ہے۔ کہ اس لذت انگیز مسرت سے تو آج تک میں بیگانہ ہی رہا وہ جھینپ گئی۔ اور دوسری سمت دیکھنے لگی اور مجھے یوں لگا جیسے اس نے سن لیا ہو۔

ایک روز صبح ملی تو کہنے لگی میں نے رات خواب میں صحرا دیکھا ہے۔ چند لمحے توقف کے بعد بولی "خواب میں صحرا دیکھیں تو کیا ہوتا ہے، میں خاموش رہا کچھ نہ بولا، بس اس کی طرف دیکھتا رہا اس نے شاید پڑھ لیا تھا کہنے لگی کیا سفر درپیش ہوتا ہے۔ میں پھر بھی چپ رہا۔ بس بینچ کی ٹوٹی ٹانگوں کی طرف دیکھنے لگا جسے اینٹوں نے سہارا دے رکھا تھا۔ اس نے بتایا آج رات اس نے خواب میں صحرا دیکھا تھا۔ چلچلاتی ہوئی دھوپ تھی دور تک کہیں نخلستان نہیں تھا۔ کہنے لگی میں نے کوشش کی کہ کہیں سراب میں ہی پانی کا چشمہ نظر آ جائے مگر دور دور تک پانی کا نشان تک نہیں تھا۔

میں خاموش بیٹھا سنتا رہا۔ اس روز نہ تو اس نے پازیب پہنی ہوئی تھی اور نہ ہی

اس کے کانوں میں جھمکے تھے۔ اس کی آنکھوں میں صحرا کی وسعت سمٹ آئی تھی میں بہت دیر تک اور بہت دور تک خود کو ڈھونڈتا رہا مگر اس حقیقت پسند لڑکی کی آنکھوں میں کہیں میرا عکس نہیں تھا۔

عجیب لڑکی تھی۔ خواب سناتے اس کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں جیسے حقیقی احوال بیان کر رہی ہو۔ مگر کچھ ہی دیر بعد ایسے ہو جاتی جیسے آنکھوں کے سمندر میں کبھی مد و جزر آیا ہی نہ ہو۔

ایک روز ملی تو اس نے مکمل طور پر سفید لباس پہنا ہوا تھا گرمیوں کی صبح ہم لوگ وسطی صحن کے شمالی کونے میں اسی بنچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کہنے لگی "آج رات میں نے بہت سے کبوتر اڑائے سفید رنگ کے۔ مگر کوئی کبوتر لوٹ کر واپس نہیں آیا۔ میں ہر اگلا کبوتر اس لیے اڑا دیتی شاید یہ پہلے والے کو ساتھ واپس لے آئے۔ مگر صبح ہو گئی اور میں بیدار ہو گئی تم سے بھی تو ملنا تھا۔" اگر تم سے نہ ملنا ہوتا تو اب تک میں کبوتر ہی اڑا رہی ہوتی۔ یہ خواب سنا کر وہ بہت دیر تک زمین کی طرف دیکھتی رہی۔ شاید پلکوں پر لرزتے موتیوں نے انہیں بہت بوجھل کر دیا تھا کہ وہ انہیں اٹھا بھی نہیں سکتی تھی۔ پھر اچانک اس نے میری سمت دیکھا اور کہنے لگی پتا ہے اس خواب کی کیا تعبیر ہوگی پھر قدرے توقف کے بعد بولی تمہیں علم ہے کبوتر انتظار کی علامت ہوتا ہے۔ میرے پاس اور بھی کبوتر تھے میں انہیں اڑاتے ہوئے خواب کو مزید جاری رکھ سکتی تھی۔ آخر کب تک؟ تم سے بھی تو ملنا تھا۔ اس لیے میں خود ہی کبوتر بن گئی اور تمہارے کاندھوں پر آن بیٹھی ہوں۔ اس روز میں بہت چاہتا تھا کہ کسی طرح اپنا بازو اپنا کندھا ہلاؤں شاید اسی طرح یہ کبوتر اڑ جائے مگر میں ایسا نہ کر سکا۔

ایک صبح ہی صبح مجھے ملی اور میرا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ بہت جلدی میں تھی۔ اس روز اس نے پازیب بھی پہنی ہوئی تھی اور جھمکے بھی، پازیب کی چھن چھن کے ساتھ جھمکے یوں لہرا رہے تھے جیسے جھوم رہے ہوں۔ دسمبر کی دھند آلود دھوپ

میں ٹیرس پر پہنچتے ہی کہنے لگی۔ آج خواب میں دیکھا میں نے بالکل سفید بے داغ لباس پہنا ہوا ہے۔ اور کہیں سے کیچڑ کا ایک چھینٹا اسے آلودہ کر دیتا ہے۔ یہ جملہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں کے دیپ جیسے یکسر بجھ گئے ہوں۔ بہت افسردہ ہو گئی مگر پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ کہیں سے دو ہاتھ آئے انھوں نے میری قمیض کے پلو کو دونوں ہاتھوں سے مسلا تو وہ بالکل صاف ہو گئی جیسے پہلے تھی۔ یہ بات کہتے ہوئے اس کی آواز کھنک دار ہو گئی اور آنکھیں خوشی سے پھیل کر موتی ہو گئیں۔ جیسے رات بہت گہری نیند سوئی ہو۔ میرے دونوں ہاتھ اس کے ہاتھوں میں تھے اور کہنے لگی اس کی تعبیر کیا ہو سکتی ہے؟

بہت دیر سوچتی رہی، اور پھر جیسے اسے اس کی تعبیر سمجھ آ گئی ہو۔ اس نے بے خیالی میں پکڑے ہوئے میرے دونوں ہاتھ چھوڑ دیئے اور ٹیرس کے دوسرے کونے پر جا کر کھڑی ہو گئی۔ جہاں دھوپ نہیں تھی۔ دسمبر کی لمبی راتوں میں کورے میں بھیگی ٹھنڈی زمین تھی میرا سایہ میرے قد سے بہت لمبا ہو گیا تھا اور میں ٹیرس پر لیٹے ہوئے اپنے سائے کو پاؤں سے کرید رہا تھا۔ میری پلکیں اُوپر نہیں اُٹھ رہی تھیں۔ شاید موتیوں کی جھالر نے انہیں بہت بوجھل کر دیا تھا۔

(یکم جنوری ۱۹۹۲ء)

☆☆☆

عذاب النار

اب میں سوچتا ہوں کاش میں نے یہ کہانی نہ لکھی ہوتی۔

میرے سامنے ایک خط کھلا پڑا ہے جو مجھے اس رسالے کے مدیر نے ارسال کیا ہے جس میں میری یہ کہانی شائع ہوئی تھی۔

میرے ایک دوست نے بھی یہ خط پڑھا ہے مگر اس نے اسے دیگر خطوط کی طرح سمجھ کر کوئی اہمیت نہیں دی مگر جو مجھے علم ہے اس سے میرا دوست آگاہ نہیں۔ خط کا مضمون ایک پھانس بن کر میرے دل میں چبھ گیا ہے اور جب دل دھڑکتا ہے تو تکلیف کا احساس اور بڑھ جاتا ہے۔

کاش اس نے یہ خط نہ لکھا ہوتا یا پھر میں نے یہ کہانی نہ لکھی ہوتی۔ اب تک تو میں کہانیاں اس لیے لکھتا چلا آیا تھا کہ ان میں میں وہ سچ بول لیتا تھا جو اپنی زبان پہ نہیں لاسکتا تھا مگر اس کہانی کی اشاعت کے بعد مجھے اس سچ کا علم ہوا۔ تو مجھے پتہ چلا کہ میری کہانیاں کتنا بڑا جھوٹ ہوتی ہیں۔

یونیورسٹی داخلہ کے بعد جس چہرے پر میری نظریں ٹھہر گئی تھیں۔ وہ چہرہ بہت سادہ اور عام سا تھا لباس کے معاملے میں بھی کوئی انفرادیت نہیں تھی۔ اور اس عمومیت نے ہی میرے لیے اسے خاص بنا دیا تھا۔ اتنے بڑے شہر میں پرورش پانے کے باوجود

لباس اور اطوار میں اس قدر سادگی اور معصومیت نے اسے بہت دلکش بنا دیا تھا۔ چونکہ وہ میری ہم جماعت تھی اس لیے اس سے ملنا بات کرنا روزمرہ کا معمول تھا۔ اور میں چاہتا تھا کہ غیر محسوس طریقے سے اس کی ذات کے حصار میں داخل ہو جاؤں اور اس کے لیے میں نے نہایت احتیاط سے کوشش شروع کر دی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا۔ کہ وہ بدک جائے۔

کافی عرصہ تک میرا خیال تھا کہ اسے میری توجہ کا احساس نہیں ہوا۔ اور وہ عام کلاس فیلو کی طرح ہی مجھے سمجھتی ہے مگر کچھ عرصہ بعد یکے بعد دیگرے کچھ ایسی باتیں ہونے لگیں کہ مجھے یقین کرنا پڑا کہ وہ میری خصوصی توجہ کا مفہوم سمجھنے لگی ہے اور اسی وجہ سے مجھ سے گریز کرنے لگی ہے۔ یہ احساس میرے لیے خاصا تکلیف دہ تھا بات یہاں تک ہوتی تو اتنی اہم نہ تھی۔ جلد ہی مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ نثار بیگ کی توجہ کی خواہش مند ہے۔ اور یہ احساس میرے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ نہ تھی کہ اس نے مجھے نظر انداز کر دیا تھا۔ بلکہ اس کی وجہ نثار بیگ خود بھی تھا۔ تعلیمی معاملات میں اس کے ساتھ میری حریفانہ کشمکش تو تھی ہی اس کے علاوہ اور کئی باتوں کی وجہ سے ہمارے درمیان شخصیتی اختلافات تھے۔

میرا خیال یہ تھا کہ نثار بیگ اپنی ذات کے حصار میں محبوس وہ شخص ہے جو ذاتی غرض اور مطلب پرستی کو ہر بات پر ترجیح دیتا تھا۔ اگرچہ میں بھی کوئی اتنا سوشل نہیں تھا مگر پھر بھی نہ جانے کیوں نثار بیگ مجھے پہلے دن سے ہی چبھنے لگا تھا۔ اور اب اس احساس کے بعد تو میرے لیے اس کا وجود ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔

افسانہ نگار ہونے کے حوالے سے کسی کردار کو پرکھنا اور جانچنا کوئی ایسی مشکل بات نہ تھی اور میں سمجھتا تھا۔ کہ کس طرح دو کرداروں کے درمیان فاصلے بڑھائے جاتے ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں اپنے اور اس کے درمیان تعلق کی وہ شکل تو قائم نہ کر سکا تھا جو میری خواہش تھی مگر نثار بیگ اور اس کے درمیان فاصلوں کا بیج ضرور بو سکتا تھا۔

اور یہیں سے میرا مکروہ کردار شروع ہوتا تھا۔

کلاس میں ایک سروے کے سلسلے میں ہم نے مختلف گروپوں میں کام کرنا تھا۔ گروپ رول نمبر کے حوالے سے تشکیل دیے جاتے تھے۔ میرے اور اس کے رول نمبر میں اتنا فاصلہ تھا کہ ہم ایک گروپ میں شامل نہیں ہوسکتے تھے۔ مگر اس کا اور نثار بیگ کا رول نمبر بالکل ساتھ ساتھ تھا۔ ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ کہ ایک گروپ میں کتنے ارکان ہونگے میں نے حساب لگایا کہ اگر ہر گروپ میں چھ ارکان ہوں تو نثار بیگ اور اس کے درمیان حدِ فاصل کھینچی جاسکتی ہے۔ میں کلاس ریپریزنٹیٹو تھا۔ اور یہ کام میرے لیے کوئی ایسا مشکل نہ تھا۔ اور اتنی آسانی سے ہو گیا تھا کہ کسی کو شائبہ تک نہ ہوا تھا۔

مگر یہ کافی نہ تھا مجھے دونوں کے درمیان فاصلے بڑھانے کے لیے کچھ اور کرنا تھا۔ اور جو میں نے بتدریج کیا دونوں میں سے بغیر کسی کو اس کا احساس دلائے۔

میں نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ میں جب نثار بیگ کے پاس بیٹھا ہوا ہوں تو وہ صرف اتنا کہہ دے۔ "وہ میرے لیے پیغام چھوڑ گئی تھی کہ کسی اہم معاملے میں مجھ سے بات کرنا ہے۔ لہٰذا آج شام ضرور گھر فون کرلوں۔

اس کے ساتھ میری دوستی تو تھی ہی مگر اب میں نے اس کو دوسرے رنگ میں استعمال کرنا شروع کر دیا تھا میں کسی بھی طرح سے نثار بیگ کو یہ احساس دلانا چاہتا تھا کہ میرے اور اس کے درمیان بہت قریبی مراسم پیدا ہو چکے ہیں۔ اور اس کے لیے مجھے بعض اوقات ہلکے پھلکے ڈرامے کرنا پڑتے تھے۔

ہوٹل میں ایک فنکشن تھا جس میں ہماری تمام کلاس نے شرکت کرنا تھی۔ میرے آنے سے پہلے میرا ایک دوست نثار بیگ کو ساتھ لے کر پہلے ہی ہوٹل پہنچ چکا تھا۔ اور ہال میں اپنی نشست پر بیٹھ چکا تھا۔ جب وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ آئی تو عین اس جگہ جہاں ان لوگوں نے ہال میں داخل ہونا تھا۔ میں نے اس کو آواز دے کر روک

لیا۔ اور یونہی ایک آدھ بات کر لی۔ مقصد صرف یہ تھا کہ لڑکیوں کے ہال میں داخل ہونے اور ہمارے داخل ہونے کے درمیان وقفہ آ جائے۔ اور جب میں اس کے ساتھ ہال میں داخل ہوا۔ تو نثار بیگ جس کے دل میں پہلے ہی گرہ پڑ چکی تھی۔ اسے یہ فیصلہ کرنے میں قطعاً دیر نہ لگی کہ ہمارے روابط کس نہج تک آن پہنچے ہیں۔

مجھے پورا یقین تھا۔ کہ نثار بیگ کبھی بھی اس معاملے کی چھان بین نہیں کرے گا۔ اور خود ہی اپنی ذات کے حصار میں بند فیصلہ کر لے گا اور پھر کبھی بھی اس کے قریب نہیں جائے گا۔

وہ پہلے نثار بیگ کے ساتھ وقتاً فوقتاً بات کر لیتی تھی۔ لائبریری میں اس کے ساتھ بیٹھ جاتی تھی۔ نثار بیگ کا رویہ بھی خاصا مثبت تھا۔ مگر اب بتدریج یہ فاصلے بڑھنے لگے تھے۔ اور باہم گفتگو کا وقفہ طویل تر ہونے لگا تھا۔ اور میرے لیے یہ احساس بہت مسحور کن تھا۔

اس کے بعد فائنل کے امتحان قریب آ گئے اور ہم اپنے اپنے گھروں میں محدود ہو کر رہ گئے۔ کبھی کبھار بات ہو بھی جاتی تو امتحانات اور نصابی موضوعات سے باہر نہ نکلتی۔

میں آخری دنوں تک اسے اپنی توجہ کا احساس دلاتا رہا۔ اور وہ آخری لمحوں تک مجھ سے گریز کرتی رہی۔ ہاں کبھی کبھار نثار بیگ کا تذکرہ آ جاتا تھا۔ وہ پتہ نہیں کیوں اسے بیچ میں لے آتی تھی۔ اور یہی بات میرے لیے تکلیف دہ تھی۔ مگر نثار بیگ اس سے بہت دور جا چکا تھا۔ اور یہ اطمینان میرے لیے کافی تھا۔

پھر پتہ چلا کہ اس کی شادی ہو گئی ہے۔ گویا اس کے بعد اس کے بارے میں سوچنا میرے لیے بے معنی تھا۔ مگر پھر بھی یوں ہی کبھی کبھار وہ یاد آ ہی جاتی تھی۔ اور پھر میرا مکروہ کردار میرے لیے قابل نفرت ہوتا گیا۔ ٹھیک ہے اگر اس کی دلچسپی مجھ میں نہ تھی۔ مگر میں کون تھا جس نے اس کے اور نثار بیگ کے درمیان فاصلے بو دیئے

تھے۔ اور یہ احساس ایک پھانس بن کر میرے دل میں چبھ گیا تھا۔ میں جب بھی تنہائی میں اپنے ساتھ بیٹھتا تھا تو وہ ادھر ادھر سے نکل آتی۔ مجھے اس کا احساس ہو جاتا تھا۔ اور پھر کہیں سے نثار بیگ بھی نکل آتا یہی وہ کہانی تھی جو لکھنے کے بعد مجھے یوں لگا تھا۔ جیسے میرے دل سے پھانس نکل گئی ہے جیسے میں نے اپنے مکروہ جرم کا اعتراف کر کے خود کو سزا دے لی تھی۔ مگر مجھے کیا علم تھا۔ کہ کہانی چھپ جانے کے بعد ایک نیا رخ اختیار کر لے گی۔

اس نے خط میں لکھا تھا۔ "شادی کے بعد میں اسی گھر میں آئی تھی جہاں آنے کے خواب میری آنکھوں میں یونیورسٹی سے بہت پہلے رچ بس گئے تھے۔ جو شخص میرا شریک سفر بنا وہ بہت پہلے میری رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔ یہاں آنے کے بعد کبھی کبھار مجھے آپ کا دھیان آ جاتا مگر ایسے ہی جیسے آتا تھا پھر چلا جاتا تھا۔ البتہ کبھی کبھی میرے لیے یہ احساس خاصا تکلیف دہ ہو جاتا تھا۔ اور میں خوف سے ڈر جاتی تھی۔ کہ میں نے آپ جیسے مخلص سچے اور اچھے انسان کی توجہ کا مثبت جواب نہیں دیا تھا۔ مگر آپ سے قبل میری ایک اور کمٹمنٹ تھی۔ اور اسی کمٹمنٹ نے مجھے ہمیشہ آپ سے دور رکھا۔ بلکہ میں نے خود اپنے آپ کو آپ سے دور رکھا۔ نثار بیگ سے مجھے کبھی بھی دلچسپی نہ تھی۔ البتہ جب کبھی آپ میری طرف بہت تیزی سے بڑھتے چلے آئے۔ تو مجھے مجبوراً نثار بیگ کو ڈھال کے طور پر استعمال کرنا پڑتا تھا۔ وہ آپ کا تعلیمی میدان میں حریف تھا۔ اور اسی وجہ سے میں نے اس کا انتخاب کیا تھا۔ آپ نے اتنا سچ لکھ جتنا آپ کو علم تھا۔ اور یوں آپ نے مجھے بھی سچ بولنے کا موقع فراہم کر دیا اور ایک مدت سے جو پھانس میرے دل میں تھی آج نکل گئی ہے بالکل اسی طرح جیسے یہ کہانی لکھنے کے بعد آپ کے دل سے وہ پھانس نکل گئی تھی۔ آپ بہت اچھے اور سچے انسان ہیں۔ مجھے ادب سے کبھی بھی دلچسپی نہیں رہی مگر اسے میری خوش قسمتی سمجھ لیجیئے کہ میرا چھوٹا دیور ادب سے دلچسپی رکھنے کے باعث اکثر و بیشتر ادبی رسائل و کتب گھر لاتا

رہتا ہے۔ یہ رسالہ جس میں آپ کا افسانہ چھپا تھا ہمارے گھر ایک مدت سے باقاعد گی سے آرہا ہے۔ ایک روز یونہی آپ کے کسی افسانے پر نظر پڑ گئی تھی۔ اور میں نے اسے پڑھ لیا تھا۔ پھر اس کے بعد میں نے گذشتہ سارے شمارے کھنگال ڈالے آپ کی کہانیاں پڑھنے کے لیے۔ اور پھر ہر ماہ آپ کی نئی کہانی کی منتظر رہتی۔ آج یہ کہانی پڑھی تو علم ہوا کہ آپ اپنے بارے میں بھی کتنی سچی اور کھری بات لکھ گئے ہیں کہ بے اختیار آپ کی صداقت پر ایمان لانے کو جی چاہتا ہے۔ میری نظر میں آپ کی تکریم پہلے سے بھی دو چند ہو گئی ہے۔ اس رسالے کے مدیر کے توسط سے آپ تک رسائی حاصل کر رہی ہوں امید ہے یہ خط آپ تک پہنچ جائے گا۔"

یہ خط پڑھ لینے کے بعد مجھے خوش ہونا چاہیے تھا یا ناخوش اس بات کا فیصلہ تو میں نہ کر سکا۔ البتہ ایک لمحے کے لیے یہ احساس کوندے کی طرح لپکا اور اس نے مجھے عذاب النار میں دھکیل دیا کہ جس شخص نے اپنے بارے میں بھی نامکمل اور ادھورا سچ لکھا ہے۔ وہ جب دوسروں کے بارے میں لکھتا ہو گا، تو وہ تمام کہانیاں کتنی جھوٹی ہوتی ہوں گی۔

(اپریل ۱۹۹۱ء)

☆☆☆

ایک جنم اور

شیریں کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے بیٹھے فرہاد کو کم و بیش ساڑھے تین گھنٹے ہو گئے تھے اور ابھی تک شیریں کی کوئی اطلاع نہ تھی۔

"آفس سے تو تین بجے چھٹی ہو جاتی ہے۔ ہاں کبھی کبھار لیٹ ہو جاتی ہے---- اور آج کوئی ڈیڑھ بجے کے قریب اس کا فون آیا تھا اور اس نے خالہ بی کو بتا دیا تھا کہ وہ آج لیٹ ہو جائے گی---- کتنی لیٹ؟ یہ خالہ بی کا سوال تھا مگر اس کا جواب شیریں کے پاس خود بھی نہیں تھا کیوں کہ یہ تو اس کے باس پر منحصر تھا۔ پرائیویٹ دفاتر میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ بس یونہی---- فارغ بیٹھے بیٹھے جب شیریں بور ہو گئی تو اس نے اس کنسٹرکشن فرم میں ملازمت شروع کر لی تھی۔ محض وقت گزاری کے لئے----مگر اب تو جیسے وقت اسے گزار رہا تھا----

یہ وہ باتیں تھیں جو فرہاد کو لحہ بہ لحہ گزرنے والے ساڑھے تین گھنٹوں میں خالہ بی سے معلوم ہوئیں۔ اس دوران دو مرتبہ فون کی گھنٹی بجی جسے خالہ بی نے اٹھایا---- گفتگو سے یہی قیاس تھا کہ شیریں کی سہیلیوں میں سے تھیں جو شیریں کے گھر پہنچ جانے کے بعد اس سے بات کرنا چاہ رہی تھیں مگر شیریں کی ابھی تک کوئی اطلاع نہ تھی۔

تیسری مرتبہ خالہ بی گرم گرم چائے لے کر آئیں۔ تو فرہاد نے کوٹ اتار کر

ایک طرف کرسی پر لٹکا دیا اور آتش دان میں جلنے والی آگ کے شعلوں پر نظریں جما دیں۔ سرخ آگ اپنی دسترس میں پڑی ہر شے کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ سیاہ کر دیتی ہے مگر جو چیزیں جل کر راکھ نہیں ہوتی وہ سرخ انگارہ ہو جاتی ہیں۔ اس بات کا اسے بارہا تجربہ ہوا تھا۔

چائے کا مگ ہاتھ میں پکڑتے ہوئے اس نے خالہ بی سے مزید معلومات حاصل کرنے کی خاطر کسی بالواسطہ سوال کے بارے میں سوچا مگر اس اثناء میں وہ جا چکی تھیں۔ اس نے اپنی آنکھیں کھڑکی سے باہر لگی بوگن ویلیا پر ٹکا دیں۔ جس نے برآمدے کے ستون اور دیوار کے کچھ حصے کو اپنے سبزے میں لپیٹ رکھا تھا۔ ڈھلتا ہوا سورج درختوں کے سائے لمبے اور ان کے رنگ اور بھی سبز کر دیتا ہے۔

اس کے باپ نے جب اس کا نام فرہاد رکھا تھا۔ تو اس کی ماں نے بہت مخالفت کی تھی۔ پتہ نہیں اس کی ماں کے ذہن میں یہ بات کیسے بیٹھ گئی تھی۔ کہ فرہاد کا کام تو نہر نکالنا ہے کوہ کاٹنا ہے اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا تمام عمر تیشہ زنی کی لاحاصل مشقت سے گزرے۔ اس بات کا ذکر اس نے فرہاد کے باپ سے بھی کیا تھا۔ مگر فرہاد کے ابا۔۔۔ جو ہمیشہ کے خوش طبع تھے ہنستے رہتے اور کہتے۔۔۔ بیگم ناموں میں کیا رکھا ہے۔ اگر اس کے مقدر میں فرہاد کی سی مشقت ہے تو خواہ کوئی بھی نام رکھ لو۔۔۔ یہ تو اسے ہی کاٹنا ہو گی۔ اور یہ بات تب سے اس کے ذہن میں بیٹھ گئی تھی۔ بہت بچپن سے، اور جو باتیں بچپن میں ذہن نشین ہو جائیں تو پھر وہ نہ تو ذہن سے نکلتی ہیں اور نہ ہی ان کے اثرات کی گرفت سے انسان باآسانی نکل سکتا ہے۔

شیریں سے اس کا تعارف جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے سے بہت پہلے ہوا تھا۔ اور یہ تعلق بہت پرانا تھا۔ شاید اس وقت ان دونوں کو علم بھی نہیں تھا کہ تعلق کی یہ شکل انہیں کس موڑ پر لا کھڑا کرے گی۔

ایف ایس سی میں داخلہ کے وقت اس کے والد نے اسے انجینئرنگ یونیورسٹی

میں داخلہ کیلئے پری انجینئرنگ کے مضامین لے کر دیئے تھے۔ یہاں بھی ماں کی مخالفت شامل تھی۔ ماں اسے ڈاکٹر بنانا چاہتی تھی۔ مگر والد کو علم تھا کہ ڈاکٹرز کے حالات آج کل بہت خراب ہیں اور خصوصاً جب فرہاد ڈاکٹر بن کر نکلے گا تب تک تو ڈاکٹرز کی ملازمتوں میں اور بھی کمی آچکی ہو گی۔ اسے علم تھا کہ وہ اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ پانچ سال میڈیکل کالج میں پڑھانے کے بعد فرہاد کو وہ کسی اسپیشلائزیشن کے لئے بیرون ملک بھیج سکے گا۔

اب یہ فرہاد کی اپنی قسمت تھی--- کہ اس میں ایسا ہی لکھا تھا--- کہ اس کا داخلہ میرٹ کی بنیاد پر الیکٹریکل کے بجائے سول انجینئرنگ میں ہوا تھا۔ اور اس نے انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور سے چار سالہ انجینئرنگ کا کورس لیٹ سیشن کے ساتھ ساڑھے پانچ سالوں میں مکمل کیا تھا۔ نمبر اس کے اچھے تھے بلکہ بہت اچھے تھے۔ مگر ڈیڑھ سال کی بے روزگاری کے بعد بھی اسے کوئی مناسب ملازمت نہ مل سکی۔ اور وہ محض تجربہ حاصل کرنے کی خاطر پرائیویٹ فرموں میں ملازمتیں کرتا چلا آیا تھا۔ اور یہ محض اتفاق تھا کہ وہ اخبار میں سعودی عرب کی ملازمت کے لیے چھپنے والے اشتہار کے لیے درخواست بھجوا بیٹھا تھا۔ انٹرویو کال آئی تو وہ چلا گیا۔ اور اس کی سلیکشن بھی ہو گئی۔

یہ اس کی پہلی سلیکشن تھی۔ ڈیڑھ سال کی بیروزگاری کے بعد اس سلیکشن سے اسے نہ تو خوشی ہوئی اور نہ وہ رنجیدہ تھا۔ جانے سے قبل جب وہ آخری بار شیریں سے ملا تھا تو وہ خوش تھی۔ اس نے بھی تو شیریں کو تسلی دینے کے لیے کہہ دیا تھا کہ سال دو سال کی تو بات ہے بس پھر وہ اپنی شیریں کو لے جائے گا اور شیریں تو بہت پہلے سے ہی اپنے آپ کو فرہاد کی امانت سمجھتی تھی۔

سعودی عرب کی جس کمپنی میں فرہاد کو ملازمت ملی تھی وہ ایک لینڈ ڈویلپمنٹ کی فرم تھی۔ اور ریاض میں ایک ہاؤسنگ سکیم کے لئے زمین کے ترقیاتی کام اس کے

ذمہ تھے۔ ترقیاتی کام ابھی مکمل نہ ہوئے تھے کہ گھروں اور دیگر عمارتوں کی تعمیر کا کام بھی اسی فرم کو مل گیا۔ اور یوں دو سے تین اور تین سے چار --- ہوتے ہوتے سات سال گزر گئے۔ ہر سال کے آغاز میں فرہاد یہی سوچتا یہ سال آخری ہوگا۔ بس دسمبر میں کام ختم ہوجائے گا اور وہ اپنی شیریں کے پاس چلا جائے گا۔ مگر نئے کاموں کا سلسلہ کچھ اس تواتر سے چل نکلا کہ نہ تو اسے چھٹی ملی اور نہ ہی فرصت۔ البتہ شیریں سے اس کا رابطہ قائم تھا۔ کبھی خط و کتابت اور کبھی فون ---- ہر بار جب بات ہوتی تو محض چند مہینوں کا بہانہ کرکے وہ واپس آنے کا وعدہ کرلیتا اور یوں اس عمل میں سات سال گزر گئے۔

اور اب سات سال کے بعد وہ اچانک آگیا تھا۔ اس نے شیریں کو اطلاع بھی نہیں دی تھی۔ وہ اسے سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ مگر اسے اندازہ نہیں تھا کہ انتظار کے لمحات پھیل کر گھنٹوں پر محیط ہوجائیں گے، اور یہ چند گھنٹے صدیوں جیسے بوجھل ہوجائیں گے۔

بیٹھے بیٹھے اس نے سوچا کہ آفس فون کرکے شیریں کو بلا لے مگر دفتری مصروفیات کی نوعیت سے وہ آگاہ تھا۔ دوسرا وہ شیریں کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ اور ویسے بھی شیریں کے انتظار کی لذت کا نشہ اس کو مست کئے ہوئے تھا۔ آخر شیریں بھی تو اس اذیت سے گزر رہی تھی ---- سات سال --- بہت لمبا عرصہ ہوتا ہے۔

اس نے سگریٹ سلگانے کے لئے جیب سے لائٹر نکالنے کے بجائے آتش دان کے کوئلوں سے مدد لی۔ اور دھویں کے مرغولے ہوا میں چھوڑتے ہوئے چھت کی جانب دیکھنے لگا۔

خالہ بی چوتھی بار چائے کا کپ لے کر آئیں تو اس نے محض بات کرنے کی غرض سے ان سے پوچھا کہ شیریں کون سے دفتر میں کام کرتی ہے۔ گمنام کنسٹرکشن کمپنی ---- کنسٹرکشن کمپنی --- ہاہا --- اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اسے یاد آگیا تھا کہ

ایک بار شیریں نے اس سے پوچھا تھا کہ آپ کونسی انجینئرنگ کر رہے ہیں۔ تو اس نے بڑی تفصیل سے اسے جواب دیا تھا کہ وہ کاغذوں پر آرکیٹکٹس کے بنائے ہوئے اور خیالوں میں سوچے ہوئے منصوبوں کو عملی شکل دیتے ہیں۔ دریاؤں کے دو پاٹوں کو ملانے کے لیے ان پر پل تعمیر کرتے ہیں۔ شہروں میں باہمی رابطے کے لیے سڑکیں بناتے ہیں۔ پُرسکون زندگی گزارنے کے لیے عمارتیں تعمیر کرتے ہیں---- "تو گویا آپ لوگوں کے خوابوں کو عملی جامہ پہناتے ہیں۔ حقیقت کا رنگ دیتے ہیں" کس مختصر انداز میں شیریں نے اس کی ٹیکنیکل گفتگو کو ایک جملے میں سمیٹ دیا تھا۔ فرہاد شیریں کی صلاحیتوں کا ہمیشہ سے ہی معترف رہا تھا۔ خصوصاً ادب وغیرہ سے دلچسپی کے باعث شیریں کی خوبصورت زبان اور خیالات کی تازہ کاری ہمیشہ اسے معطر کرتی تھی۔

"کیا نام بتایا خالہ بی آپ نے"---- گلفام کنسٹرکشن کمپنی---- گلفام---- گلفام---- شہزادہ گلفام---- ایک بازگشت تھی اس نام کی جس نے فرہاد کو ہلا کے رکھ دیا تھا۔ ایک لمحے میں کتنے ہی خدشات تھے جو آنکھوں کے سامنے سے گزر گئے۔ اچانک بیٹھے بیٹھے واہموں کی لپیٹ میں آجانے والوں کے لئے باہر نکلنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔"

"گلفام کون ہے خالہ بی"---- شیریں تو یہی بتاتی ہے مالک کا نام ہے۔ بڑی تعریفیں کرتی ہے اس کی---- بہت کم عمر میں اس نے اپنی فرم بنالی ہے اور اب ملکی سطح کے بڑے بڑے تعمیراتی کام اس کے دفتر میں ہوتے ہیں۔ کافی بڑی فرم ہے۔ اسی لیے تو اتنی اتنی دیر ہو جاتی ہے بیٹی کو---- میں تو بہت کہتی ہوں مگر وہ کسی کی سنے تو پھر ناں---- مگر فرہاد بیٹا اب تم آگئے ہو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں شیریں سے کہہ کر اس کے ابا اور امی کو انگلینڈ سے بلواتی ہوں---- تاکہ وہ بھی اپنے فرض سے سبکدوش ہوں---- بیٹا انہوں نے تو بہت کہا---- مگر شیریں کسی کی سنے تو پھر ناں! مگر تمہاری بات نہیں ٹالتی----

شہزادہ گمنام---- جوں جوں یہ نام وہ زیرِ لب دہرا رہا تھا نیچے اور نیچے----
گہرائی میں گرتا جا رہا تھا۔ اسے اپنی سانس بند ہوتی ہوئی محسوس ہوئی اس نے گھبرا کر
اپنی آنکھیں کھول دیں اور تیز سانسیں لینے لگا۔ تنفس بحال کرنے کے لیے---- مگر بلڈ
پریشر--- یوں لگتا تھا جیسے ڈاؤن ہی ہوتا جا رہا ہے۔ اور جیسے ابھی خون کی گردش رک
جائے گی۔

شیریں جب واپس لوٹی تو بہت خوش تھی بالکل تازہ دم---- تمام دن دفتر میں
کام کرنے سے جو اعصابی تھکن ہو جاتی ہے اس کا احساس تک نہیں تھا۔ اور یہ بات
فرہاد کے لئے اور بھی تشویشناک---- شبہات کی کھائی میں تو وہ پہلے ہی گر چکا تھا۔ اب یہ
صورت حال دیکھی تو اور بھی لڑکھنیاں کھانے لگا۔

شیریں فرہاد کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی مگر فرہاد کو یہ سب مصنوعی لگ رہا تھا۔
کئی دن گزر گئے۔ کچھ تو شیریں کی مصروفیات تھیں کچھ فرہاد بھی کھچا کھچا تھا۔ پھر بھی
شیریں نے دو تین مرتبہ اس سے ملاقات کے لئے وقت نکالا مگر اس کے پاس دفتری
مصروفیات پر بات کرنے کے علاوہ کوئی اور موضوع تھا ہی نہیں وہ دفتر میں گمنام
صاحب کی پرائیویٹ سیکرٹری کے طور پر کام کر رہی تھی۔

اسی میں دو تین مہینے گزر گئے۔ شیریں کے والدین ستمبر میں آ رہے تھے اور
ابھی پانچ چھ مہینے پڑے تھے۔ شیریں کے اصرار پر ہی فرہاد نے گمنام کنسٹرکشن کمپنی
میں ملازمت کر لی۔ ابتداء میں تو یہ کنسٹرکشن کمپنی ہی تھی مگر بعد ازاں اسے انجینئرنگ
کے دیگر پراجیکٹس بھی ملنے لگے۔ مگر نام اس کا یہی چلتا رہا گمنام صاحب جو اس کے
پروپرائٹر تھے بہت اچھے آدمی تھے۔ عمر میں فرہاد سے کوئی سال اوپر سال بیچے ہوں
گے۔ مگر چند سالوں میں ہی انہوں نے کاروبار میں اپنے پاؤں جما لیے تھے۔ گمنام صاحب
بلا کے محنتی اور ذہین۔ شب و روز کی تمیز کئے بغیر مصروفیات میں جتے رہتے اور یہی ان
کی ترقی کا راز تھا۔ ہر وقت خندہ پیشانی سے ملتے۔ ورکر ان کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے

تھے۔

پہلے تو فرہاد نہ مانا مگر شیریں کے اصرار پر اس نے یہ آفر قبول کرلی۔ ابھی دو ہفتے ہی ہوئے تھے کہ ایک نہر کی کھدائی کا کام گلفام کنسٹرکشن کمپنی کو مل گیا۔ کمپنی کی طرف سے جو سائٹ سروے اور مجوزہ پلان پیش کیا گیا تھا وہ بعینہ منظور کرلیا گیا تھا۔ سروے کے مطابق نہر کو پہاڑوں میں سے کھود کر لانے سے بہت سارے فوائد مل رہے تھے۔ انتظامیہ نے انجینئرز کی جو ٹیم اس نہر کی کھدائی کے لئے منتخب کی تھی، اس میں فرہاد کا نام بھی شامل تھا۔ یہ سب محض اتفاق تھا مگر فرہاد کے ذہن میں پتہ نہیں کیوں بیٹھ گیا تھا کہ گلفام صاحب نے ارادتاً اسے اس پراجیکٹ کے لئے نامزد کیا ہے اور اسے بھیج رہے ہیں۔

وہ جانے سے پہلے شیریں سے بہت الجھا۔ مگر شیریں کی خواہش تھی کہ فرہاد یہ نوکری جاری رکھے اور اس کے لئے لازم تھا کہ وہ نہر کی کھدائی والے پراجیکٹ پر چلا جائے۔ شیریں کا ویسے بھی خیال تھا کہ ایک دو مہینوں کے بعد وہ گلفام صاحب سے کہہ کر اسے ہیڈ آفس بلوا لے گی اور یہ بات پھر فرہاد کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی بس سوئی کہیں اٹک گئی تھی۔

سائٹ پر جانے سے پہلے ایک مرتبہ پھر اس نے سوچا اس کی ماں اب بھی اسے بھیجنے کے لئے تیار نہ تھی مگر ابا کے پھر وہی الفاظ تھے کہ ناموں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر اس نہر کی کھدائی فرہاد کی قسمت میں لکھی ہوئی ہے تو پھر اس نے ہی اسے کاٹنا ہے۔ نام خواہ وہ کوئی بھی رکھ لے۔ ایک وقت تھا جب وہ سوچتا تھا کہ شاید شیریں اسے اس لئے مل گئی کیونکہ وہ فرہاد تھا۔ اور اب سوچتا کہ کاش وہ فرہاد نہ ہوتا۔

نہر کا پراجیکٹ مکمل تو ہو گیا مگر تیشے کی آخری ضرب کے ساتھ فرہاد بھی ٹوٹ پھوٹ گیا۔ شیریں نے اپنے خوابوں میں حقیقی رنگ بھرنے کے لیے زیادہ انتظار نہ کیا ابھی فرہاد کی قبر کی مٹی سوکھی بھی نہ تھی کہ اس نے گلفام سے شادی کرلی۔ البتہ فرہاد کی

ماں دن کا بیشتر وقت فرہاد کی قبر کے سرہانے گزارتی ہے۔ دیکھنے والے کہتے ہیں فرہاد کی ماں ہنستے ہنستے رو پڑتی ہے اور روتے روتے ہنس پڑتی ہے۔ اور ایک ہی بات کہے جاتی ہے۔ "ناموں سے کیا فرق پڑتا ہے---- کچھ بھی رکھ لو---- ہا ہا---- ہا ہا ہا---- نام کچھ بھی رکھ لو---- کیا فرق پڑتا ہے---- کچھ بھی تو نہیں---- ہیں ناں فرہاد کے ابا کچھ بھی تو نہیں فرق پڑتا----

(فروری ۱۹۹۳ء)

☆☆☆
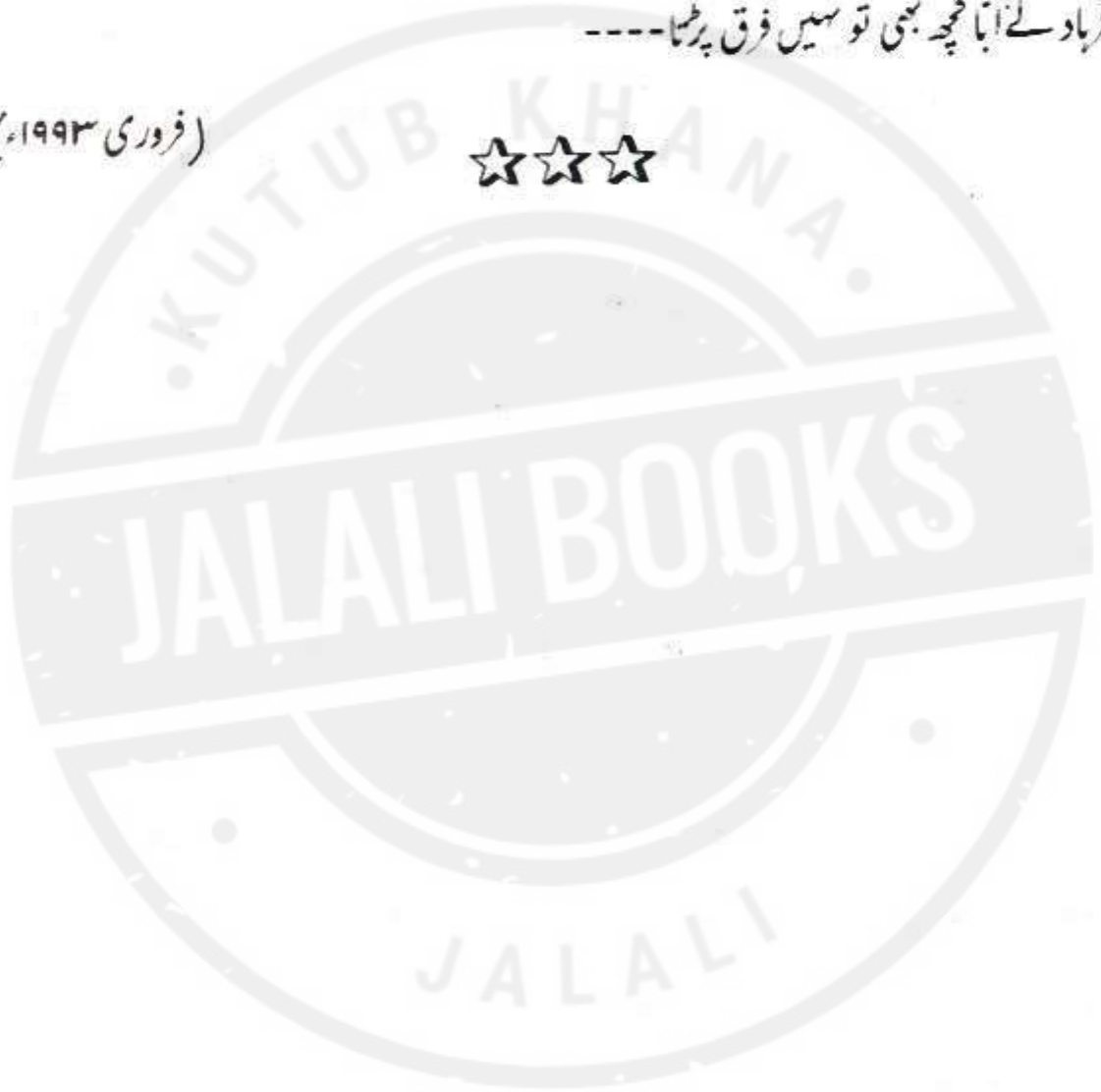
آخری سورج

گلی کا موڑ مڑنے کے بعد ٹیکسی بڑی سڑک پر آ گئی۔ اس نے حدِ نگاہ تک دیکھا مگر دور دور تک کہیں کسی سواری کا کوئی امکان نہیں تھا۔

اس وقت سہ پہر کے ساڑھے تین بجے تھے۔ اور جون کے مہینے میں تو ویسے بھی سورج سوا نیزے پر آ کر ٹھہر جاتا ہے۔ مگر آج تو جیسے اس سے بھی نزدیک آ گیا تھا۔ جلا دینے والی دھوپ میں پوری آنکھ کھول کر دیکھنا بھی دشوار ہو گیا تھا۔ سرخ بتی پر رکا تو اسے چند قدم دور دو تین بچے نظر آئے میلے کچیلے پسینے سے لتھڑے ہوئے کپڑوں میں ان بچوں کو دیکھ کر اس کا دھیان امجی کی طرف چلا گیا۔ امجی اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ نام تو اس کا امجد تھا مگر جب اس نے بولنا شروع کیا تو اپنی ماں کو امجی کہتا تھا۔ تب سے اس کا نام امجی پڑ گیا تھا۔ امجی پانچ دن سے بستر پر پڑا تھا۔ اور ان پانچ دنوں میں اس نے اپنی بساط سے بہت بڑھ کر اس کا علاج کروایا تھا۔ مگر بخار تھا کہ ٹوٹ ہی نہیں رہا تھا۔ اگر تھوڑی دیر کے لیے ٹمپریچر کی شدت کم ہو جاتی تو امجی آنکھیں کھول دیتا اور ماں اور باپ دونوں کی آنکھوں میں زندگی لوٹ آتی۔ پانچ دنوں کے اس بخار نے امجی کو تنکے کی طرح ہلکا کر دیا تھا۔ تندرست تو پہلے بھی وہ اتنا نہیں تھا مگر پھر بھی بھاگتا دوڑتا رہتا۔ اور چھوٹی موٹی شرارتوں سے گھر میں رونق لگی رہتی۔ مگر گذشتہ پانچ دنوں سے تو جیسے گھر کو سانپ

سونگھ گیا تھا۔ ایسی خاموشی کہ بس امی کی سانس لینے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اور گھر کے در و دیوار سے ایسی وحشت اور خاموشی ٹپک رہی تھی جیسے جنگل کی بلاؤں نے یہاں آن بسیرا کیا ہو تھوڑا بہت جو پس انداز کیا ہوا تھا ان پانچ دنوں میں ختم ہو گیا تھا۔ اس مسلسل پریشانی اور رات دن کی مصروفیت میں وہ ایک بار بھی ٹیکسی لے کر نہ جا سکا۔ ایک دن نکلا بھی تو بڑی سڑک پر پہنچنے سے قبل ہی اس کے دل کی دھڑکن میں شدید اضافہ ہو گیا اور وہ چند گز بھی آگے نہ چل سکا۔ واپس ٹیکسی لا کر کھڑی کر دی۔

اور آج پانچویں روز جب اس کی جیب بالکل خالی ہو گئی۔ اور ڈاکٹر کی لکھی ہوئی دوا لانے کے لیے ایک چونی بھی نہ رہی تو اس نے ہمت کر کے ٹیکسی نکالی۔ اس وقت امی نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ یا شاید سویا ہوا تھا۔ بس ایک اطمینان تھا کہ سانس چل رہا ہے۔ اس وقت جب کہ پرندے بھی درختوں میں پتوں اور آشیانوں میں دبکے ہوتے ہیں۔ وہ ہمت کر کے ٹیکسی بڑی سڑک تک لے آیا تھا۔ امی کی ماں کو تسلی آمیز کلمات کہتے ہوئے اس کی اپنی آنکھیں بھی چھلک پڑی تھیں۔ مگر اس جلتی سہ پہر میں دور دور تک کسی سواری کا امکان تک نہیں تھا۔

اس وقت اسے شہر سے باہر یا کسی دوسرے شہر کی سواری چاہیے تھی۔ تاکہ کچھ روپے تو مل جاتے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے ٹیکسی کا رخ ائیرپورٹ کی طرف موڑ دیا۔ پتہ نہیں اس وقت کوئی فلائیٹ آ رہی ہو یا نہیں۔ پھر بھی اسے پتہ نہیں کیوں ایک امید سی بندھ رہی تھی۔ انتہائی مایوسی کے لمحات میں انسان یہی کچھ تو کرتا ہے خود کو زندہ رکھنے کے لیے اور جدوجہد جاری رکھنے کے لیے خود کو دیئے جانے والے اس طرح کے دلاسے بڑے کارآمد ہوتے ہیں۔

شیر پاؤ پل اتر کر وہ اس وقت کینٹ کے علاقے میں داخل ہو چکا تھا۔ کہ جب اسے بغلی سڑک میں دور ایک لڑکا نظر آیا۔ ٹیکسی کو دیکھ کر اس نے ہاتھ لہرایا پہلے تو اسے شک گزرا مگر ٹیکسی روک کر جب اس نے ریورس کی تو ایک تیرہ چودہ سال کا بچہ

بہت تیزی سے بھاگتا ہوا نظر آیا۔ وہ تو کسی دوسرے شہر کی سواری کی تلاش میں تھا جو اسے کم سے کم وقت میں کچھ رقم دے سکے۔ مگر یہ بچہ۔۔۔۔ پتہ نہیں کیوں اس نے ائیر پورٹ جانے کا خیال رد کر دیا اور انہی چند لمحوں میں وہ لڑکا اس تک آن پہنچا تھا۔ سانس بُری طرح پھولا ہوا تھا۔ اور پسینے نے اس کو بھگو دیا تھا۔ اکھڑی ہوئی سانسوں میں اس نے جتنی بھی بے ربط بات بتائی تھی۔ اس سے یہی پتہ چل سکا کہ اس کی بہن کی ناک اور منہ سے خون پھوٹ رہا ہے۔ اور رک نہیں رہا۔ شیخ زاید ہسپتال جانا ہے۔

شیخ زاید۔۔ ہسپتال چند کلو میٹر کے فاصلے پر۔ یہ لوگ اسے کیا دیں گے زیادہ سے زیادہ پچیس تیس روپے مگر اسے امی کی دوا کے لیے زیادہ روپوں کی ضرورت تھی۔ ایکسلریٹر پر دباؤ بڑھانے سے قبل اس نے لڑکے کی طرف دیکھا۔ لڑکے کے چہرے پر پھیلی ہوئی بے چارگی اور مجبوری کی زنجیر نے اسے بری طرح جکڑ لیا۔ اور وہ ائیر پورٹ نہ جا سکا۔ لڑکی جو غالباً اس کی بہن تھی اس کے منہ سے اور ناک سے خون واقعی بہت تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اور لحہ بہ لحہ اس کے چہرے پر شفق شام بن کر پرتوں میں ڈھل رہی تھی۔ اس نے لڑکی کو اور اس کی ماں کو پچھلی سیٹ پر بٹھایا اور لڑکا دوڑ کر اگلی سیٹ پر آن بیٹھا۔ اور ٹیکسی کا میٹر آن کر دیا۔

اور اگلے چند لمحوں کے بعد وہ شیر پاؤ کا پل واپس اتر رہا تھا۔ جیل روڈ پر آتے ہوئے وہ نہر والی سڑک پر مڑنے کے بجائے پتہ نہیں کیوں اس کی مخالف سمت مڑ گیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد وہ شاہراہ قائداعظم پر تھا۔

لڑکی کی ماں پوری توجہ سے اس کی ناک سے بہنے والے خون کو تولیے میں جذب کر رہی تھی۔ اور اسے یہ یقین ہو گیا تھا۔ کہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے لڑکے کو شیخ زاید ہسپتال کے راستے کا علم نہیں ہے۔ گورنر ہاؤس کے سامنے سے جب وہ شادمان کی طرف مڑا تو اس نے بیک مرر میں ایک مرتبہ پھر اطمینان کر لیا کہ خاتون کا دھیان اس کی طرف نہیں ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد لڑکے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ انکل ذرا

جلدی کریں۔ خون بہت زیادہ بہہ رہا ہے۔۔۔۔ انکل پلیز اور تیز۔۔۔۔۔ اور تیز شادمان سے وہ فیروز پور روڈ پر آن نکلا اور پھر کینال روڈ پر مڑ گیا۔

ٹیکسی تو وہ کافی سپیڈ سے چلا رہا تھا۔ مگر اچانک بڑھ جانے والے فاصلے کا احساس لڑکی کی ماں کو نہ ہو سکا۔ بس اس نے ایک مرتبہ کہا جلدی جلدی مجھے ہسپتال پہنچا دو۔ کہیں بہت زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے۔۔۔۔۔۔۔۔ جملہ پورا کرنے سے پہلے ہی ماں کا دھیان بیٹی کی ادھ کھلی آنکھوں کی طرف چلا گیا۔ اور وہ اس کا نام لے کر چیخ چیخ کر اسے پکارنے لگی۔ آنکھیں کھولو۔۔۔۔۔۔۔۔ آنکھیں کھولو۔ مگر ان چند لمحوں میں ٹیکسی کینال روڈ پر ہوتی ہوئی یونیورسٹی کیمپس سے آگے نکل گئی تھی۔ وہاں سے وہ وحدت روڈ کی طرف مڑا۔

ٹیکسی جب ایمرجنسی وارڈ کے سامنے رکی۔ تو اس وقت لڑکی نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ اور ٹیکسی ڈرائیور کی نظریں میٹر پر لگی ہوئی تھیں۔ بتیس کلو میٹر۔۔۔۔۔ یعنی ایک سو ساٹھ روپے۔

لڑکی کو ایمرجنسی وارڈ میں لے گئے۔ اور اس خاتون نے ڈرائیور کو ایڈریس دے کر بیٹے کو ساتھ بٹھا دیا۔ اور کہا کہ جتنی جلدی ممکن ہو اس کے والد کو آفس سے بلاؤ اور واپسی پہ ساتھ ہی لیتے آنا۔ اور ہاں انہیں کہنا کہ اے پازیٹو بلڈ کا بندوبست بھی کرتے آئیں۔ اتنا خون بہہ جانے کے بعد یقیناً خون کی ضرورت پڑے گی۔

لڑکی کے والد کو لانے اور اے پازیٹو بلڈ کا بندوبست کرنے میں ٹیکسی نے اتنے کلو میٹر طے کر لیے تھے کہ جب ٹیکسی ایمرجنسی وارڈ کے سامنے آن کر رکی۔ تو ڈرائیور کے چہرے پر اطمینان تھا۔

رقم لے کر جب اس نے جیب میں ڈالی اور ٹیکسی کو ریورس کرنے لگا تو اس کی نظر سامنے پڑی وہ عورت اپنے خاوند سے لپٹ کر رو رہی تھی چیخ رہی تھی وہ کسی بھی قسم کا جملہ کانوں میں انڈیلے جانے سے قبل ہسپتال چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ مگر بغیر کوئی آواز

سنے بغیر دیکھے پتہ نہیں اسے کیسے اس بات کا علم ہو گیا۔ کہ ایک زندگی کا چراغ گل ہو گیا تھا۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں تھا۔ دور کہیں عصر کی اذان ہو رہی تھی۔ اس دھویں میں راستہ دیکھنا دشوار ہو گیا تھا۔ اس نے ہیڈ لائٹس آن کر دیں اور ٹیکسی اپنے گھر کی سمت جانے والی سڑک پر پوری تیزی سے بھگا دی۔

راستے میں پتہ نہیں کہاں سے اس نے دوائی خریدی۔ اسے پتہ اس وقت چلا جب اس نے ٹیکسی باہر بڑی سڑک پر ہی کھڑی کر دی۔ اور تقریباً بھاگتے ہوئے اس تین فٹ چوڑی گلی میں داخل ہو گیا جس میں چند موڑ کے بعد اس کے گھر کا دروازہ تھا۔ وہ گھر دوسری گلی سے آیا کرتا تھا۔ اور ٹیکسی عموماً دوسرے راستے سے گھر کے قریب ہی کھڑی کرتا تھا۔ مگر اس طرح اسے پندرہ منٹ زائد لگ جاتے۔ اور وہ یہ وقت بھی بچانا چاہتا تھا۔ بڑی سڑک سے اس تنگ گلی کا راستہ صرف تین چار منٹ کا تھا۔

اس نے گھر کا دروازہ کھولا۔ تو پورا گھر دھویں کی لپیٹ میں تھا۔ یہ دھواں پتہ نہیں کہاں سے آ گیا تھا۔ اسی دھویں میں اسے اپنی بیوی کا چہرہ نظر آیا۔ اور پھر امی ۔۔۔۔ جو چہرے پر اطمینان اوڑھے سو رہا تھا۔ ساتھ ہی دوسرے بستر پر وہ لڑکی لیٹی ہوئی تھی سارا بستر سرخ لہو میں بھیگا ہوا تھا۔ اور قطرہ قطرہ خون زمین پر ٹپک رہا تھا۔ دھویں کا ایک بادل آیا اور اس نے دونوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دوائیں اس کے ہاتھ سے نیچے گر گئیں تھیں۔ اور اس کی بیوی اس سے لپٹ کر رو رہی تھی۔ دور کہیں سے اذان کی آواز آ رہی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ اندھیرا ہر شے کو نگل رہا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے سورج پھر نہ نکلنے کی قسم کھا کر ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا ہو۔

(اکتوبر ۱۹۹۱ء)

☆☆☆

ہابیل

میں نے اسے قتل کرنا تھا۔

شہر کے صدر دروازے تک پہنچنے سے بہت پہلے میں نے اسے قتل کرنا تھا۔

چند روز کے بعد امیرِ شہر نے مجھے تمغۂ وقار عطا کرنا تھا۔ جس کے بعد میں بھی باقاعدہ طور پر اس بستی کا مکین ہونے والا تھا۔ میری حالت کا اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں۔ جو دیارِ غیر میں اجنبی بن کر رہے ہوں۔ تیسرے درجے کا شہری بن کر زندہ رہنا ایسے ہی ہے جیسے مینڈک۔ بارش ہو گئی تو ٹرانا شروع کر دیا۔ بند ہو گئی تو زیرِ زمین چلے گئے اور اپنی جلد کی رنگت مٹی جیسی بنا کر اپنے ہونے کو نہ ہونے کے برابر کر دیا۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ کہ امیر شہر مجھے تمغۂ وقار بخشنے والے تھے۔ کتنے برس ہو گئے تھے۔ اس صبر آزما انتظار میں مجھے کیسی کیسی اذیت سے گزرنا پڑا۔ اب سوچتا ہوں تو باقاعدہ پسینے میں شرابور ہونے لگتا ہوں اور اب جبکہ چند روز کے بعد عافیت کی سعید گھڑی آنے والی تھی۔ اچانک مجھے خبر ملی۔ اس کے ہونے کا اعتبار مل گیا اور یہ بھی پتہ چل گیا۔ کہ اس نے شہر کے صدر دروازے کی سمت سفر شروع کر دیا ہے۔ ایسی صورتحال سے اگر مجھے کچھ عرصہ بعد دوچار ہونا پڑتا۔ تو شاید میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہتی۔ مگر موجودہ صورتحال میں اس کا صدر دروازے تک پہنچ جانا نہ صرف مجھے آسمانوں

سے بے اعتباری کی زمین پر لا پٹختا بلکہ آنے والا وقت اس کے ساتھ مجھے بھی کبھی توقیر نہ بخشتا۔

اگر مجھے پہلے سے اس کی آمد کی اطلاع مل جاتی تو شاید میں اس کے وجود کے لیے شہر میں کوئی گنجائش نکال لیتا۔ مگر اس وقت جبکہ میرا وجود خود بے توقیر تھا۔ اس کے لیے میری ذات کا تعارف کسی طرح بھی فائدہ مند نہیں تھا اور مجھے جو چند دنوں کے بعد تکریم ملنے والی تھی۔ اس کی آمد کی اطلاع کے ساتھ ہی اس کا ختم ہو جانا یقینی تھا۔

ہاں مجھے اعتراف ہے وہ میری ہی شخصیت کی توسیع تھا۔ میری شخصیت کا حصّہ تھا۔ اس نے میرے وجود سے جنم لیا تھا۔ وہ میرا سایہ یا ہیولہ نہیں تھا کہ اس کا قد کاٹھ مجھ سے بہت چھوٹا تھا۔ ہاں وہ آنے والے کل میں اگر بہت کوشش کرتا تو شاید میری شخصیت کی گھنی چھاؤں سے باہر نکل کر اپنا الگ وجود بنا لیتا۔

مگر یہ ساری بعد کی باتیں تھیں۔ فی الحال تو اس کا وجود میرے لیے کسی ڈائنامیٹ سے کم نہ تھا۔ کہ اس کی آمد کے دھماکے کے ساتھ ہی میری عزت و تکریم کا محل یکسر زمین بوس ہو جانا تھا۔

دراصل اس شہر میں اس کی جان پہچان والا واحد آدمی میں تھا۔ اور مجھے اس شہر نے ابھی تک قبول نہیں کیا تھا۔ شہر کے صدر دروازے پر آ کر اس نے میرا حوالہ ہی شناخت کے لیے دینا تھا اور اسی باعث سارا معاملہ ایکسپوز ہو جانے کا خدشہ تھا۔

ہاں میں نے کسی چور دروازے ------- یا اندھیر راستے کے بارے میں بھی سوچا تھا۔ کہ چلو اس طرح وہ مجھ تک آن پہنچے اور ایسا ممکن بھی تھا۔ اگرچہ بہت مشکل تھا۔ مگر میں اسے شہر کے مکینوں سے آخر کب تک چھپا کر رکھ سکتا تھا اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ اس کی شناخت کا حوالہ اور زیادہ ابھر کر سامنے آتا اور میرے جیسے اجنبی شخص کے لیے اس بدیسی شہر میں ایسی صورتحال سے نبھا کرنا اور بھی مشکل ہو جانا تھا۔ میرے پاس اس بات کا کوئی حل موجود نہیں تھا اور نہ ہی اتنا وقت کہ میں امیرِ شہر سے باقاعدہ

کوئی اجازت نامہ طلب کر سکتا اور پھر وہ جس تیزی سے شہر کی سمت بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ یہ بات میری توجہ میں یکسوئی ہی پیدا نہیں ہونے دے رہی تھی کہ میں کوئی بہتر راستہ سوچ سکتا۔

شہر کے صدر دروازے پہ کھڑے دربانوں سے بات بے سود تھی۔ وہ مان بھی جاتے۔ تو اس شہر میں اس کے خدوخال کی اجنبیت اسے فوراً گرفتار کرا دیتی اور پھر ساتھ ہی میں بھی گرفت میں آ جاتا۔

پچھلے کئی دنوں کی شب بیداری اور سوچ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا۔ کہ اس مسئلے کا واحد حل یہی ہے۔ کہ اسے شہر کے صدر دروازے تک پہنچنے سے بہت پہلے قتل کر دیا جائے اور طریقہ کار کچھ ایسا اختیار کیا جائے۔ کہ کسی کو شبہ تک نہ ہو۔

اس کے ہونے کی اطلاع صرف مجھے تھی۔ بلکہ اپنے ہونے کا اسے خود بھی شعور نہیں تھا۔ نہ اسے راستے کی خبر تھی اور نہ منزل کا پتہ تھا اور قبل اس کے کہ اسے اپنے ہونے کا شعور ہو جاتا یا کسی اور تک اس کی خبر پہنچ جاتی مجھے نہایت سرعت اور احتیاط سے اس کا وجود ٹھکانے لگانا تھا۔ مگر کس طریقے سے؟ اس بات کا فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ جو بات بھی سوچتا۔ اس میں خود ہی خدشے کا کوئی نہ کوئی کیل نکل آتا اور میں اسے مسترد کر دیتا۔

غلطی مجھ سے ہی ہوئی تھی۔ اوائل میں ہی مجھے اس کو ٹھکانے لگا دینا چاہیے تھا۔ دیر دراصل اس کے ہونے اور نہ ہونے کی کیفیت سے ہوئی۔ اس تیزی سے اس کے توانا ہو جانے کے باعث خوف اور دہشت کی کیفیت میرے اعصاب کو شل کر رہی تھی۔ میرے سر میں ایک خاص نوعیت کا درد مستقل رہنے لگا تھا اور اب مسئلہ بقاء کا پیدا ہو گیا تھا اور ظاہر ہے زندہ تو مجھے ہی رہنا تھا۔ اس لیے بھی کہ وہ تو ابھی ظہور پذیر ہی نہیں ہوا تھا اور مجھے چند روز کے بعد تمغہ وقار ملنے والا تھا۔ جس کے بعد مجھے باقاعدہ طور پر اس شہر کا شہری بن جانا تھا اور پھر شہر کے صدر دروازے پر میرا تعارف اور میرا حوالہ

میرے ہر ملنے والے کے لیئے وجہ امتیاز بن جاتا تھا۔

پرائے شہر میں کسی کو راز دار بنا کر اس سے مدد لینا کسی طرح بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس کی واحد صورت یہی تھی۔ کہ میں خود شہر کی حدود سے باہر جاتا اور اسے قتل کر دیتا۔ مگر شاہی مہمان خانے سے اس طرح غائب ہونا بھی مجھے مشکوک کر سکتا تھا۔ اس سارے عمل کے لیے خاص سوچ سمجھ اور منصوبہ بندی کی ضرورت تھی۔ تمام راستوں اور وقت کی حدود کا تعین کرنا تھا۔ شام غروبِ آفتاب سے لے کر طلوع سحر سے بہت پہلے مجھے لوٹ آنا تھا۔

میں شہر کی مرکزی لائبریری میں چلا گیا اور وہاں موجود نقشہ جات کی مدد سے شہر کے چاروں اطراف علاقے کا تفصیلی جائزہ لینے لگا۔

مغرب کی جانب بہت بڑا اور گہرا سمندر تھا۔ جو اکثر طغیانیوں کی زد میں رہتا۔ بستی کے تجار یہ بحری راستہ کبھی تجارت کے لیے استعمال کرتے تھے۔ مگر اب تو مدت ہو گئی۔ سمندر کی طغیانیوں کے باعث پے در پے کئی جہاز ڈوبے اور یوں تاجروں نے یہ بحری راستہ ترک کر دیا۔

شہر کے شمال کی جانب گھنا جنگل تھا۔ کہ اس کی زمین پر کبھی سورج کی آتشیں کرنیں نہیں پہنچی تھیں اور پھر لکھنے والوں نے لکھا ہے۔ کہ یہاں چیر پھاڑ کرنے والے جنگلی درندوں کی بہتات ہے۔ ویسے بھی جنگل اتنا گھنا اور خارزار ہے کہ اس سمت سفر کرنا دشوار ترین ہے۔

جنوب کی سمت شہر کا صدر دروازہ تھا اور ایک بہت بڑی شاہراہ کہ جہاں سے قافلے دوسرے شہروں سے آتے جاتے رہتے۔ مسافر سفر کرتے۔ اس بڑی شاہراہ پر سرائیں بھی تعمیر کی گئی تھیں۔ ہموار راستہ تھا۔ رات اور دن اونٹوں اور گھوڑوں کی سہولت بھی میسر تھی۔ مگر اس راستے میں کسی کے مل جانے کا اور پہچانے جانے کا پورا پورا اندیشہ نہیں بلکہ یقین تھا۔

البتہ شہر کے مشرق کی جانب کچھ دور تک صحرا تھا۔ کچھ نشیب و فراز اور اس کے بعد ایک پہاڑی سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ ان پہاڑوں نے جیسے جھک کر بستی پر سایہ کیا ہوا تھا۔ لکھنے والوں نے لکھا تھا۔ کہ اگر ان پہاڑوں کی چوٹی پر چڑھ جائیں تو طلوع ہونے والا سورج کئی گھنٹے پہلے ہی نظر آ جاتا تھا۔

راستہ دشوار گزار ضرور تھا۔ مگر ناممکن نہیں تھا اور جان جانے کا خطرہ بھی نہیں تھا۔ میری نظریں اسی راستے پر ٹھہر گئی تھیں۔ اگر ان پہاڑوں کی چوٹی پر چڑھ جاتا تو دوسری سمت اتر سکتا تھا اور بخوبی اس تک پہنچ سکتا تھا۔ بستی سے ایک خاص فاصلے کی حدود سے باہر میں جہاں بھی ہوتا اس سے مل سکتا تھا اور پھر میں بآسانی اس کو قتل کر سکتا تھا۔

تقریباً تمام تفصیلات میں نے لائبریری میں ہی طے کر لی تھیں اور تمام جزئیات کا جائزہ لینے کے بعد میں مہمان خانے میں لوٹ آیا اور شام ڈھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ اندھیرا پھیلتے ہی میں چھت پر پہنچ گیا۔ شہر کے سارے مکان ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ ان چھتوں پر چلتے ہوئے میں شہر کی آخری مشرقی حدود تک پہنچ گیا اور پھر شہر کی فصیل سے دوسری سمت کود گیا۔ راستہ واقعی دشوار گزار تھا اور بستی پر جھکا ہوا پہاڑ جو بظاہر نزدیک نظر آ رہا تھا۔ اتنا نزدیک نہیں تھا۔

صحرا کی مسافت کے بعد اونچا نیچا علاقہ شروع ہو گیا اور پھر ستاروں کی رہنمائی میں میں پہاڑ کی چوٹی تک پہنچ گیا۔ ڈھلوان راستہ اگرچہ آسان تھا۔ مگر بہت احتیاط طلب۔ کیونکہ ڈھلوان ایسی عمودی تھی کہ ذرا سا پاؤں پھسلا اور ہزاروں فٹ کی گہرائی منہ کھولے کھڑی تھی۔

جونہی شہر سے باہر فاصلے کی حد ختم ہوئی وہ مجھے مل گیا اور میں نے مزید وقت ضائع کیے بغیر اسے قتل کر دیا۔ وہ ابھی اپنے ہونے اور نہ ہونے کی شعوری منزل تک نہیں پہنچا تھا۔ اس نے اپنی مدافعت کے لیے ہاتھ پاؤں بھی نہیں مارے بلکہ چپکے سے

آسانی سے قتل ہو گیا۔ میں نے اس کا ایک ایک عضو علیحدہ کیا اور بکھیرتا رہا۔ حتیٰ کہ اس کا سارا تشخص جو کہ بالآخر میری ہی پہچان کا حوالہ بننا تھا۔ بالکل ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور مکمل اطمینان کر لینے کے بعد میں نے واپسی کا سفر شروع کیا۔

اگلے روز شہر میں جشن تھا۔ سارا دن ہنگامے اور شور شرابے میں گزرا۔ یہ جشن رات گئے تک جاری رہا۔ جس میں مجھے تمغہ وقار بخشا گیا۔ میرے چہرے پر ایک اطمینان اور سکون تھا۔ مجھے کوئی خوف نہ تھا۔ ڈر نہ تھا۔ تمغہ وقار میرے سینے پر جگمگا رہا تھا اور میں شہر کے معززین میں شامل ہو چکا تھا۔ امیرِ شہر نے میرے لیے اپنی خاص عنایات کا اعلان کیا تھا۔ لوگ میری توقیر و تعظیم میں جھکے جا رہے تھے۔ اجنبی ہونے کے باوجود میں شہر کی اشرافیہ میں شامل ہو چکا تھا۔ اگرچہ مجھ سے پہلے بھی چند ایک اجنبی لوگوں کو یہ توقیر بخشی گئی تھی۔ مگر پھر بھی ایسے لوگ بہت کم تھے اور میں ان میں سے ایک تھا۔

آج ایک مدت گزر گئی ہے۔ بلکہ یوں لگتا ہے جیسے زمانے گزر گئے ہوں۔ میری شخصیت اس شہر کے لوگوں کے لیے عزت و تکریم کی علامت بن چکی ہے۔ میری بڑی شدید خواہش ہے کہ کوئی اس شہر کے صدر دروازے پر آ کر میرے حوالے سے اپنا تعارف کروائے اور پھر اپنی عزت و وقار سے میری تعظیم و تکریم کا اندازہ لگائے۔

میں چاہتا ہوں ایسا ہو۔ مگر اب اس کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ کہ اسے تو برسوں پہلے میں اپنے ہاتھوں سے قتل کر چکا ہوں۔ زمانے بیت گئے۔ شہر کے صدر دروازے پر کبھی کسی نے آ کر میرے نام کے حوالے سے اپنا تعارف نہیں کروایا۔ کبھی دستک نہیں دی۔

(۳۰- دسمبر ۱۹۹۱ء)

☆☆☆

ایک خواب کی بشارت

وہ تین تھے--- نہیں میرا خیال ہے وہ دو تھے--- یا پھر شاید ایک۔

اس کے بارے میں اندازہ لگانا بہت مشکل تھا ہاں اتنا ضرور یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اول اول وہ ایک سے دو اور پھر دو سے تین ہوئے تھے مگر یہ کب کیسے اور کس طرح ہوا اس کا پتہ نہ تھا۔ جیسے دن رات میں پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب زندگی سے محروم جڑوں نے پھوٹ کر اپنا تشخص قائم کرنا شروع کر دیا۔

ہاں آج کی رات یہ بات یقینی تھی کہ وہ تین تھے اور تینوں ایک دوسرے سے جدا ہونے والے تھے۔ آخری مرتبہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ یہ آخری رات وہ تینوں اکٹھے گزاریں گے اور صبح کا سورج طلوع ہونے سے پہلے جدا ہو جائیں گے۔ اس لیے ساری رات جاگنا ضروری تھا۔ انھیں ڈر تھا کہ اگر وہ سو گئے تو پھر شاید طلوعِ آفتاب کے بعد ہی ان کی آنکھ کھلے اور پھر تیز روشنی میں ان کی آنکھیں ایک دوسرے کو پہچاننے سے منکر ہو جائیں اور یہ خوف ان کو ساری رات جگائے رکھنے کے لیے کافی تھا۔

یہ ان تینوں کا مشترکہ فیصلہ نہیں تھا۔ بلکہ دو نے اس کے بارے میں فیصلہ کیا تھا کہ وہ تینوں رات ایک ساتھ گزاریں گے اور ہمیشہ سے ہی ایسا ہوتا چلا آیا تھا کہ کوئی بھی فیصلہ ہوتا ان تینوں میں سے کوئی بھی دو اس فیصلے کا اعلان کرتے اور تیسرا خاموشی سے مان لیتا اور آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

تینوں کی دوستی کی وجوہات تینوں کے نزدیک مختلف تھیں۔ پہلے کا خیال تھا کہ اسے تعلیمی معاملات میں معاونت کے لیے تیسرے کی رفاقت درکار تھی اور دوسرے کے ساتھ اسے اکیلے وقت میں اچھی رفاقت مل جاتی تھی۔ دوسرے کا براہِ راست تعلق تو پہلے سے ہی تھا مگر چونکہ پہلے کا تعلق تیسرے سے تھا اس لیے تیسرے کے ساتھ بھی اس کی وابستگی ہوتے ہوتے ہو گئی۔ تیسرے کے مسائل عجیب نوعیت کے تھے۔ وہ جب مصروف ہوتا تو اسے چند لمحے نکالنا بھی مشکل ہو جاتا اور اگر کبھی کچھ لمحات نکل آتے تو انھیں گزارنا بہت تکلیف دِہ ہوتا تھا اور اسی دوران اسے پہلے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ تیسرا جب مصروف ہوتا تو بھی اکیلے پن کا شدید احساس اس کے ساتھ رہتا اور یہیں سے چوتھے کے وجود نے جنم لیا تھا۔ مگر اس کے باوجود تکون قائم رہتی کہ ایک وقت میں تین ہی اکٹھے رہ سکتے تھے۔

اب اس کے بارے میں فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ اس وقت کس کے بارے میں بات کی جا رہی ہے۔ کیونکہ یہ وابستگیاں اتنی قریب تھیں کہ ایک کے ذکر کے ساتھ ہی پتہ نہ چلتا کہ کب ایک سے دوسرے اور تیسرے کا ذکر شروع ہو گیا ہے دوپہر کو پہلا تیسرا اور چوتھا۔ تکون مکمل تھی یہ تینوں ایک ساتھ وقت گزارنے کے لیے اکٹھے ہوئے تھے مگر اس کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ تیسرے یا چوتھے---- کس کے غلط رویے کی وجہ سے چوتھا خود ہی بساط سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔ البتہ پہلا اور تیسرا دونوں ہی رنجیدہ تھے کہ چوتھے کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مگر دل کے کسی گوشے میں یہ احساس ضرور تھا کہ چوتھے کے اس ردِ عمل کے پیچھے ضرور پہلے کا یا تیسرے کا ہاتھ تھا بظاہر تو تیسرا ہی ذمہ دار ٹھہرتا تھا۔

بہر حال پہلا اور دوسرا جب دونوں تیسرے کے پاس آئے تو دونوں بے خودی کے عالم میں تھے۔ بے خودی کی یہ شکل پہلے کا ہی مسئلہ تھی چونکہ دوسرا اس سے وابستہ تھا اس لیے وہ بھی اس میں شریک ہو جاتا تھا۔

تینوں اٹھے اور ایک ساتھ باہر نکل گئے اس وقت درمیانی شب تھی۔ جنوری کا دوسرا ہفتہ تھا اور ان دِنوں سردی کی تیز لہر نے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ ان تینوں میں سے پہلے اور دوسرے نے الاؤ کے گرد بیٹھنے کا فیصلہ کیا۔ جسے تیسرے نے بخوشی قبول کر لیا الاؤ کے گرد بیٹھ کر کہانی کہنے کی روایت تو بہت پرانی ہے مگر پہلے کا خیال تھا کہ اس جلتی ہوئی آگ کے گرد بیٹھ کر اپنے آپ کو دہراتے ہیں اس لیے پہلے نے کہا کہ جس طرح آگ کا جلنا سچ ہے۔ اس طرح ہم بھی آج سچ بولیں گے۔ کم از کم آج کی رات ہم ضرور سچ بولیں گے مگر یہ پہلے کی خواہش تھی۔ دوسرے کو اس سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی اور تیسرا اس سے بچنا چاہتا تھا۔

انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر کہاں سے کہانی شروع کریں یادداشت کسی نقطۂ آغاز کو تلاش ہی نہیں کر پا رہی تھی اور نہ ہی اس حالتِ بے خودی میں ذہن کسی ایک جگہ پر مرتکز ہو رہا تھا۔

الاؤ کے گرد بیٹھنے سے قبل راستے میں وہ ایک جگہ رکے بھی تھے ان کا خیال تھا کہ یہ جگہ بھی بہت اچھی ہے۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد کسی نہ کسی کے گزرنے کی وجہ سے بہت ڈسٹربنس ہو رہی تھی۔ اور ان کا تسلسل ٹوٹ جاتا تھا پہلا اٹھا اس نے چادر وہیں رکھ دی اور چند قدم ہٹ کر ازار بند کھول کر بیٹھ گیا۔ دوسرے نے بھی اس کی تقلید کی مگر تیسرے کو اس کی حاجت محسوس نہ ہو رہی تھی کیونکہ ایک تو وہ حالتِ بے خودی میں نہ تھا اور دوسرا وہ ذہنی طور پر اپنے آپ کو پہلے اور دوسرے کے ساتھ ایڈجسٹ نہیں کر پا رہا تھا آسمان پر اکا دکا تارے چمک رہے تھے۔

الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے تینوں کو کافی دیر ہو گئی تھی چوکیدار چکر لگا کے واپس آ چکا تھا اس نے رات کی ٹھنڈک کم کرنے کے لیے یہ الاؤ روشن کیا تھا اس نے اس بات کا کوئی خاص نوٹس نہ لیا کہ وہ تینوں ابھی تک بیٹھے ہاتھ تاپ رہے ہیں۔ پہلے نے کہا دیکھو آگ کا جلنا کتنا بڑا سچ ہے۔ دوسرے نے اس کی تائید کی۔ تیسرا بولا مگر یہ سچ ہر

شے کو جلا کر راکھ کر رہا ہے۔ دوسرے نے اس بات کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ بس اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو ذرا کھولا اور پھر ایک نظر دیکھ کر ویسے ہی ہو گیا جیسا تھا۔ اس دوران جلتی ہوئی لکڑیوں میں تڑتڑ کی آواز سنائی دی۔ اس پر پہلے نے قہقہہ لگایا بہت طویل قہقہہ تھا۔ اور یہ قہقہہ وہ خاص موقعوں پر ہی لگاتا تھا۔ دوسرے نے آنکھیں کھول دیں تیسرا بھی متوجہ ہوا۔ پہلا بولا "سب نے جلنا ہے۔ سب کچھ جلنا ہے۔ کچھ چپکے سے جل جاتے ہیں اور کچھ تڑتڑ کر کے جل جاتے ہیں سب جل جاتے ہیں" .... چوکیدار نے دو چار اور لکڑیاں اوپر رکھ دیں۔ اور الاؤ پھر پہلے کی طرح بہت روشن ہو گیا۔

پہلے نے کہا کچھ سناؤ دوسرے نے بھی تائید کی اب تیسرے کی باری تھی۔ اسے تعمیل کرنا پڑی۔ وہ سناتا رہا، وہ دونوں سنتے رہے۔ اس نے کتنی ہی نظمیں سنا دیں۔ کتنے اشعار سنا دیئے۔ رات بہت ہو چلی تھی۔ چوکیدار ایک طرف دبک کے بیٹھ گیا تھا۔ پہلے اور دوسرے کو بہت بھوک لگ رہی تھی۔ دوسرے نے کہا لکشمی چلتے ہیں.......... پہلا بولا اس ٹھنڈ میں موٹر بائیک پر اتنی دور نہیں جا سکتے۔ پہلا اور دوسرا تکے یا روسٹ کھانے کے موڈ میں تھے۔ اور تیسرے کو پورا یقین تھا کہ اس وقت روسٹ نہیں ملے گا۔ پہلا پیدل ہی چلنے پر بضد تھا۔ اس کو یقین تھا کہ کوآپ سٹور چوک میں اس وقت تک روسٹ والا ضرور ہو گا۔ تینوں چل پڑے رستے میں ڈیپارٹمنٹ آتا تھا۔ ڈیپارٹمنٹ بند تھا۔ رات کے اس وقت ڈیپارٹمنٹ کے زینوں پر بیٹھ کر دوسرے نے کہا دیکھو تو لائبریری کیسی لگ رہی ہے۔ پہلے کی اس بات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے تیسرے سے کہا وہ شہزادی والی نظم سناؤ۔ تیسرا ایک مرتبہ پھر نظمیں سنانے لگا۔ نظم ختم ہوئی تو پہلے نے ایک مرتبہ پھر ایک طویل قہقہ لگایا۔ اور اٹھ کر بھنگڑا ڈالنے لگا۔ اور بولا میں نے کہا تھا کہ سچ بولو یہ سچ نہیں بول رہا تھا۔ مگر اس نظم میں اس نے اپنے بارے میں سچ بولا ہے۔ ہا!..... ہاہا۔ سچ بولا ہے مگر سچ کو بھی جھوٹ بنا کر.......... اور پھر وہ آہستہ آہستہ غمگین ہوتا گیا حتیٰ کہ وہ بلکنے لگا۔ بالکل بچوں کی طرح

سے رونے لگا۔ اور اچانک اٹھ کھڑا ہوا "چلتے ہیں" دوسرا اتنی جلدی یہاں سے اٹھ جانے کے لئے تیار نہ تھا۔ مگر پھر چل پڑا۔

تینوں کو آپ سٹور چوک پہنچے تو تکے اور سیخوں والا بند کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ ان کا خیال تھا تکے کھائیں گے.......... مگر یہاں طے ہوا چکن کڑاہی ٹھیک رہے گی۔ چکن کڑاہی بناتے بناتے بہت دیر ہو گئی تھی۔ پہلے کو جلدی تھی۔ وہ کمرے میں واپس پہنچ کر بے خودی کے تسلسل کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ جلدی کی ضد کر رہا تھا۔ دوسرا ابھی تک قائم تھا۔ اور وہ ہاتھ کے اشاروں سے جہاز اڑا رہا تھا۔ بھوک تو پہلے اور دوسرے کو لگی ہوئی تھی۔ مگر وہ پیٹ بھر کے کھانا نہیں چاہتے تھے۔ البتہ تیسرے نے خوب جی بھر کے کھایا۔ بلکہ جو بچ گیا وہ سب کچھ کھا لیا۔ اور پھر لائٹ چلی گئی۔ لوڈ شیڈنگ---- مگر کسی نے اس بات کا نوٹس نہ لیا۔ دوکاندار تینوں کے اٹھنے کے انتظار میں تھا۔ لوڈشیڈنگ نے اس کے اس مسئلے کو حل کر دیا۔

تینوں چل پڑے....... واپسی کی مسافت بہت طویل لگ رہی تھی۔ تیسرے نے پہلے کو سہارا دیا ہوا تھا۔ اتنا چلنے کے باوجود بھی کمرہ نہیں آ رہا تھا۔ یہ پہلے کا خیال تھا............ "ادھر سے نہیں ادھر سے چلتے ہیں۔" یہ تیسرے کی ضد تھی۔ "مگر کیوں ادھر سے نزدیک ہے۔" وہ تو ٹھیک ہے مگر بہتری اسی میں ہے ادھر سے اس وقت نہ گزریں۔" تیسرا بولا۔ پہلا بضد تھا۔ نہیں ادھر سے ہی چلیں گے۔" تیسرے نے دوسرے کو سمجھاتے ہوئے کہا رات کے اس وقت بیرکوں کے پاس سے گزرنا ٹھیک نہیں۔" دوسرے کو بات سمجھ آ رہی تھی۔ اس نے پہلے کو ڈانٹا اور کہا ہاں یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ادھر سے ہی چلتے ہیں............ تھوڑی دور چلے تو دوسرے نے پہلے سے کہا کہ اپنے آپ کو سنبھال کے چلو............ توازن کے ساتھ بس چند گز کے فاصلے تک.......... پہلا دونوں ٹانگوں کو اکڑا کر اور بازو پھیلا کر پریڈ کرتے ہوئے چلنے لگا.......... فاصلہ طے ہی نہیں ہو رہا تھا۔

کمرے میں پہنچے تو ابھی سورج طلوع ہونے میں کافی دیر باقی تھی۔ پہلے اور دوسرے نے اپنے تسلسل کو ٹوٹنے نہیں دیا تھا۔ تیسرے نے کمبل اٹھایا اور منہ لپیٹ کر سو گیا۔ وہ سونا نہیں چاہتا تھا اسے یاد تھا کہ آج کی رات تینوں نے سورج طلوع ہونے تک جاگنا ہے۔ مگر معلوم نہیں کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ پہلے اور دوسرے نے شیشے میں بند کڑواہٹ اپنے اندر انڈیل لی تھی۔ رات بہت طویل ہو گئی تھی۔

اگلے روز دوپہر بارہ بجے زور زور سے دروازہ پیٹنے کی آواز نے تیسرے کو بیدار کیا وہ ابھی تک سو رہا تھا۔ پہلے نے اسے خداحافظ کہا دوسرے نے موٹر سائیکل کو کک ماری اور دونوں رخصت ہو گئے۔ تیسرا ابھی پوری طرح بیدار بھی نہ ہوا تھا۔ گزشتہ کتنے گھنٹوں سے وہ جاگنے اور سونے کے عمل سے گزر رہا تھا۔ اس مسلسل بدلتی ہوئی کیفیت سے اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ ساری رات وہ ایک عجیب سا خواب دیکھتا رہا۔ وہ ایک دوکان پر کھڑا ہے اور دوکاندار ایک معصوم سا بچہ ہے۔ وہ اس سے کوئی چیز خریدتا ہے اور پرس کھول کر رقم ادا کرنے لگتا ہے تو اس کی جیب سے جعلی نوٹ نکل آتے ہیں۔ وہ ایک کڑکتا ہوا جعلی نوٹ بچے کے ہاتھ پر رکھتا ہے۔ پہلے تو بچے کو پتہ نہیں چلتا پھر کچھ شک ہوتا ہے۔ مگر اس کے اظہار سے پہلے ہی نوٹ اس کی ہتھیلی سے ہوا میں اڑ جاتا ہے۔ وہ اس نوٹ کو پکڑنے کے لئے دوڑتا ہے۔ مگر ہوا اس نوٹ کو کبھی ادھر اور کبھی اُدھر اڑائے پھرتی ہے۔ اسی کوشش میں وہ تھک جاتا ہے۔ صبح جب پہلا اور دوسرا اسے خداحافظ کہنے آتے ہیں تو وہ ابھی تھکن سے چور سو رہا ہوتا ہے۔ ان کے جانے کے بعد جب ذرا ہوش بحال ہوتے ہیں تو وہ سوچتا ہے کہ جانا تو صرف پہلے نے تھا........ مگر یہ دوسرا ابھی کیوں رخصت ہو گیا۔ مگر دوسرا تو پہلے کی وجہ سے تھا خود ہی جواب دیتا ہے۔ اچھا تو پھر وہ جو تھا؟......... وہ تو کل دوپہر ہی رخصت ہو گیا تھا۔ مگر وہ تو میری وجہ سے تھا اسے تو نہیں جانا چاہیے تھا۔ سوال تو اس نے خود سے کر لیا تھا مگر اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا......... اگر پہلا ہوتا تو شاید وہ اس کا جواب دے سکتا۔

(۱۵ جنوری ۱۹۹۳ء)

☆☆☆

صبحِ کاذب

وہ اُس بستی سے رات کو چھپ کر نکلنے والا پہلا نوجوان تھا۔

اس بستی کے سحر زدہ ماحول اور بزرگوں کی مسلسل نصیحتوں اور حکم عدولی کے خوف کی وجہ سے بستی کے تمام جوان اعصابی طور پر بہت لاغر اور ذہنی طور پر مفلوج ہو چکے تھے۔ انھی نوجوانوں کے درمیان اس نے پرورش پائی تھی اور اسی خوف زدہ ماحول میں اس کی رگوں میں خون کی گردش نے تیزی سے چلنا سیکھا تھا۔ بڑی حیران کن بات تھی۔ وہ مفلوج ہونے سے کیسے بچ گیا تھا۔ مگر اب آ کر یہ بات سمجھ آتی ہے کہ اصل مسئلہ اس شمع کے جلانے کا تھا جو اس نے اپنے من میں پہلے دن سے ہی جلالی تھی اور پھر آج تک اس کی حفاظت کرتا آیا تھا اسے علم نہیں کہ اس کی ہوش سے پہلے اس احساس نے جڑ پکڑلی تھی۔ مگر اب اس کے ہونے کے بارے میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہ تھی۔

ہاں البتہ وہ دن اسے اچھی طرح یاد ہے جب وہ پہلی مرتبہ بستی سے رات کی تاریکی میں نکلا تھا۔ اس رات سارے سفر میں جو اس پر بیتی وہ آج بھی تروتازہ ہے۔ جیسے آج ابھی کچھ دیر پہلے کی بات ہو۔

بستی سے باہر دور نظر آنے والے پہاڑوں میں ایک شمع روشن رہتی تھی۔ سب

جوان جب سنِ شعور کی بالکل ابتدائی منزلوں میں تھے تو ان کے بزرگوں نے اس پہاڑ اور اس میں جلنے والی شمع کی تپش کے بارے میں ایک عجیب قسم کا خوف ان کے اعصاب پر مسلط کرنے کا عمل شروع کر دیا تھا۔ یہ ان کی بستی کی روایت تھی۔ ابتداء میں ہی عمر کے اس حصے میں کچھ اس طرح کی خوف زدہ فضا کا حصار بنا دیا جاتا۔ کہ جب بستی کے نوجوانوں کی رگوں میں گرم لہو ٹھاٹھیں مارتا تو اعصابی طور پر کوئی بھی اس شمع تک پہنچنے کے عمل سے گزرنے کے لیے ہرگز تیار نہ ہو پاتا اور یوں عجیب مردنی سی کیفیت میں زندگی کے بقیہ ایام گزار کر ان لوگوں میں شامل ہو جاتا جنھوں نے اسے خوف زدہ کر دینے والے قصے سنائے تھے اور وہ پیچھے آنے والوں کی رگوں میں یہ خوف بھرنے لگتا۔

یہ ان دنوں ہی کی بات ہے۔ جب پہلی مرتبہ اچانک وہ اپنے گھر کی چھت پر چڑھا تھا اور اس نے اس دور جلتی ہوئی شمع کو دیکھ لیا تھا اور پھر جیسے اسے بہت قریب محسوس کر لیا تھا۔ دراصل اس کے بزرگوں نے دیر کر دی تھی۔ انھوں نے جب اسے اس جلتی ہوئی شمع کی خواہش سے باز رہنے کی تلقین کرنا شروع کی تھی تو اس وقت تک اس کو قریب سے دیکھنے اور اس کی حدتیں بدن میں بھر لینے کی تمنا پوری طرح جڑ پکڑ چکی تھی اور یقیناً یہی وجہ تھی کہ بستی کے تمام بزرگوں کی تلقین اور نصیحتوں کے باوجود اس کے دل سے اس شمع کو قریب سے دیکھنے اور چھونے کی خواہش محو نہ ہو سکی اور نہ ہی اس کے اعصاب خوف و ہراس کے تسلط میں آ کر مفلوج ہوئے اور یوں وہ اس جلتی ہوئی شمع تک پہنچنے کے لیے مناسب وقت کا انتظار کرنے لگا۔

اس کی بستی کا رواج تھا شام ہوتے ہی تمام نوجوانوں کو گھروں میں مقید کر دیا جاتا اور پھر صبح پو پھوٹنے کے بعد کہیں انھیں گھر کی دہلیز سے باہر قدم رکھنے کی اجازت ملتی۔ ایسا کیوں ہوتا تھا۔ اس بات کا تو علم نہیں ہے البتہ اس سے بہت پہلے سے یونہی ہوتا چلا آ رہا تھا اور سب اسی ارتقاء کی لڑی میں پروئے چلے جا رہے تھے۔

البتہ جب سے اس نے ایک رات چھت پر چڑھ کر دور پہاڑوں میں جلنے والی اس شمع کو دیکھا تھا۔ کچھ دنوں کے وقفے کے بعد ایک آدھ بار چند لمحوں کے لیے ضرور چھت پر چوری چھپے جا نکلتا اور پھر کچھ وقفے کے بعد اپنے کمرے میں آ جاتا۔ پہلے تو یہ وقفے قدرے قلیل رہے پھر ان میں طوالت آنے لگی اور پھر یوں ہوا وہ روزانہ کا عادی ہو گیا۔ گھر میں محلے میں کسی کو اس بات کا شائبہ تک بھی نہ تھا۔ کہ ایک نوجوان اس طرح رات گئے چھت پر جا نکلتا ہے اور پھر دیر تک اس کی نظریں اس شمع کے گرد طواف کرتی رہتی ہیں کہ جس سے بچنے اور محفوظ رہنے کے لیے بزرگ صدیوں سے چلی آنے والی روایت کو نبھا رہے تھے۔

پھر آخر ایک روز اس نے فیصلہ کر ہی لیا۔ اگرچہ یہ دن کئی ہفتوں کے بعد آیا تھا۔ تاہم کوئی غیر شعوری بات اس نتیجے تک پہنچنے کے لیے راستے میں رکاوٹ بن کر کھڑی تھی اور آخر اس نے اس تک پہنچنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

یوں تو وہ رات بستی کے تمام لوگوں کے لیے عام راتوں جیسی ہی تھی۔ مگر اس کے لیے اس رات کا تجربہ یکسر مختلف اور ہمیشہ یاد رہ جانے والا تھا۔

رات گئے جب اسے پورا یقین ہو گیا کہ بستی کا ہر باسی اس وقت نیند کی آغوش میں ہو گا تو وہ چپکے سے دبے پاؤں اٹھا۔ اس نے گھر کے بڑے کمرے کے قریب سے گزر کر اطمینان کر لیا۔ کہ تمام لوگ نیند کی حالت میں ہیں اور یوں کنڈی کھول کر وہ باہر گلی میں آ گیا۔ گلی اگلے موڑ تک اسی طرح خاموش اور سنسان پڑی تھی۔ جیسے یہاں سے کبھی کوئی گزرا ہی نہ ہو۔ گھپ اندھیری رات میں جب کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا وہ ایک اندازے سے بستی سے باہر اسی سمت کو جا رہا تھا جس طرف دور پہاڑوں کی گود میں وہ شمع روشن تھی۔ ممکن ہے یہ شمع دن کو بھی روشن ہوتی ہو مگر دن کا سورج اس کے وجود پر غالب آ جاتا تھا۔ ہاں البتہ رات کی تاریکی جب چار عالم ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔ تو اس شمع کے ہونے کا احساس ہونے لگتا۔ جس کو قریب سے

دیکھنے اور جس کی تپش کو محسوس کرنے کے لیے آج اس نے بستی کے صدیوں پرانے اصول کو توڑ دیا تھا اور کسی بھی سزا کے خوف کے بغیر اس تک پہنچنے کے لیے نکل پڑا تھا۔

بستی سے باہر نکل کر جہاں تک وہ مویشی چرانے جاتا تھا۔ وہاں تک کا سفر تو اس نے بغیر کسی خوف کے طے کر لیا تھا مگر اب آگے غیر مانوس راستے پر چلتے ہوئے اس کی سانس اکھڑنے لگی تھی۔ اس نے گرد و پیش کی پرواہ کیے بغیر اپنی آنکھیں اس روشنی کے منبع پر ٹکائی ہوئی تھیں جو آہستہ آہستہ روشنی کا گولہ بنتا جا رہا تھا۔ جوں جوں آگے بڑھ رہا تھا۔ ایک غیر مرئی کشش اس کے قدموں کی رفتار میں اضافہ کر رہی تھی۔ البتہ دل کے کسی گوشے میں دم توڑتا ہوا خوف اس کے قدم جکڑنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا۔

جنگل شروع ہونے سے پہلے اچانک ایک احساس نے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی لہر دوڑا دی۔ صبح دن کے اجالے سے قبل اسے واپس بستی میں اپنے گھر میں اپنے کمرے کی چار دیواروں کے اندر پہنچنا ہے۔ کہ سورج طلوع ہونے کے فوراً بعد اس راز کے افشاء ہونے کا پورا پورا امکان تھا کہ وہ رات بستی سے باہر رہا ہے اور یہ احساس اس کی رفتار میں ایک حیرت انگیز اضافہ کا سبب بنا۔

جوں جوں وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے اعصاب میں کھچاؤ بڑھنے لگا تھا اور پھر اسے گردن کے پٹھے اکڑتے ہوئے محسوس ہوئے۔ درد کی ایک لہر اٹھتی تھی اور پھر آپ ہی آپ دم توڑ جاتی تھی۔ اسے شمع تک پہنچنا تھا۔ اس روشنی تک پہنچنا تھا اور پھر دن کے اجالے سے بہت پہلے واپس بستی بھی پہنچنا تھا۔ وہ جب نکلا تھا تو اسے اندازہ نہیں تھا۔ کہ سفر اتنا لمبا ہو جائے گا۔ گھر کی چھت پر سے تو شمع بالکل چند کوس کے فاصلے پر نظر آتی تھی۔ مگر اتنا طویل سفر طے کرنے کے بعد بھی ابھی فاصلہ تھا کہ کٹنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

خارزار جنگلی راستے سے گزرنے کے بعد آگے ریت کا دور تک پھیلا ہوا نرم میدان تھا۔ جہاں پاؤں رکھتا اندر ہی دھنستا چلا جاتا۔ سانس تو اس کی پھول رہی تھی مگر صحرا کی ریت کی ٹھنڈک نے اس کے پیروں کو ایک عجیب ٹھنڈک سے آشنا کیا تھا۔ کہ طویل خارزار راستے کی تھکن بھی کم ہونے لگی تھی۔ صحرا کی طویل مسافت کے بعد اب اونچا نیچا علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ کبھی تو اس کا پاؤں کہیں کھڈ میں جا پڑتا اور کبھی کسی پتھر یا اونچی جگہ پر اس نے کافی کوشش کی راستے کی اونچ نیچ کا اندازہ لگانے کی۔ مگر ہر مرتبہ اس کا اندازہ غلط ثابت ہوتا تھا۔ البتہ اب اس روشنی کے قریب ہونے کا احساس ہونے لگا تھا اور اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے اس کا سفر رائگاں نہیں گیا تھا اور یہی وہ احساس تھا جس نے اس کی تمام تھکن ختم کر دی تھی۔

اس نے راستے کی ان تمام مشکلات کو طے کر لیا تھا۔ جس کا ذکر اس کے بزرگوں نے اس سے اور بستی کے نوجوانوں سے اس انداز سے کیا تھا۔ کہ کسی میں حوصلہ ہی نہ چھوڑا تھا۔ کہ اس مسافت پر نکلتا اور وہ تمام نوجوان اپنے مفلوج ذہنوں اور تھکے اعصاب کے ساتھ کمروں میں بند پڑے تھے۔

اور پھر اچانک اسے یوں لگا جیسے یک دم بہت سی روشنی کی بارش ہو گئی ہو اس کا سارا وجود اس روشنی میں بھیگ گیا۔ اتنی تیز روشنی میں بھی وہ آنکھیں کھول کر سب کچھ دیکھ سکتا تھا۔ روشنی کے اس سیلاب میں کہیں کہیں ہلکے نیلے رنگ کی لہر تیر جاتی تو اس کا جسم ایک عجیب قسم کی لذت سے سرشار ہو جاتا۔ وہ گھٹنے ٹیک کر دوزانو بیٹھ گیا۔ اس کا سر احترام کے جذبے سے جھک گیا تھا۔ لذت و سرشاری کی اس کیفیت نے اس کے اعصاب سے تھکن اور زخم ایسے کھینچ لیے تھے جیسے بے دھیانی میں چبھ جانے والا کانٹا کھینچ لیا جاتا ہے۔

روشنی کے سامنے یہ چند لمحے کی کیفیت تھی۔ وہ یک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک خدشہ وہ اپنے ساتھ لایا تھا کہ کہیں روشنی اس کے پاؤں نہ پکڑ لے۔ کہیں وہ صبح کے اجالے

سے قبل بستی پہنچنے میں ناکام نہ ہو جائے۔ مگر اس لمحے اسے یوں لگا۔ جیسے روشنی کے احساس نے ہی اس کے اندر اس فیصلے کی قوت پیدا کی ہے۔

وہ الٹے پاؤں چلتا ہوا واپسی کی مسافت طے کرنے لگا۔ روشنی اس سے دور ہونے لگی۔ مگر ایک عجیب طرح کی لذت نے اسے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا اور لحہ بہ لحہ دور ہونے کے باوجود بھی اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اب بھی وہ روشنی کے سامنے دوزانو بیٹھا ہے یہ اس کی زندگی کا پہلا تجربہ تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہ ان لذتوں کے لطف کو پوری طرح سے اپنے احساسات میں زندہ نہیں رکھ سکا اور یہی وہ احساس تھا۔ جو اسے دوبارہ یہاں آنے پر مجبور کر رہا تھا۔ دوبارہ آنے کی خواہش وہاں سے لوٹنے سے قبل ہی جڑ پکڑ چکی تھی۔

اپنی بستی میں واپس پہنچنے کو تو وہ سورج کے طلوع ہونے سے قبل ہی پہنچ گیا تھا۔ البتہ واپسی کے سفر میں قدرے مختلف تجربہ ہوا تھا۔ اب کے نہ تو پہاڑ ہی راہ میں آئے نہ صحرا تھا اور نہ جنگل بلکہ یوں لگ رہا تھا۔ جیسے بستی کو جانے والا ایک ڈھلوان راستہ ہے اور وہ مسلسل نیچے تہوں میں اترتا جا رہا ہے واپسی پہ اسے اندازہ ہوا تھا کہ اس نے کتنا بلندی کا سفر طے کر لیا تھا۔

مسلسل گہرائی میں اترنے کا یہ تجربہ بھی بہت لذت انگیز تھا۔

صبح بیدار ہوا تو رات کی یہ تمام مسافت اسے خواب کی سی کیفیت لگی۔ مگر جوں جوں اسے تمام باتیں یاد آ رہی تھیں۔ اس سارے عمل کے حقیقی ہونے کا گمان ہوتا جا رہا تھا۔ اگلا روز سارا دن معمول کے مطابق ہی تھا۔ کوئی بات کوئی لحہ گزرنے والی کل سے مختلف نہ تھا۔ البتہ وہ شام ڈھلنے سے پہلے ہی رات کا انتظار کرنے لگا تھا اس عمل کو برسوں گزر گئے۔ اس نے اپنی ان راتوں کو دل میں راز کی طرح دفن کر دیا تھا اور کبھی کسی کو شائبہ تک نہ ہونے دیا۔ ہاں البتہ کبھی کبھی اسے یہ احساس ضرور ستانے لگتا۔ کہ اس کی بستی کے تمام نوجوان ذہنی اور اعصابی طور پر مفلوج تھے اور ان میں کوئی بھی ایسا

نہیں تھا۔ جو روشنی کے اس مینار تک سفر کر سکتا۔ یوں بھی اب تو وہ اس مسافت میں تنہائی کا عادی ہو چکا تھا۔ ہاں البتہ اس میں ایک تبدیلی ضرور آئی تھی۔ کہ جب وہ عمر کے اس حصے میں پہنچا کہ جب اس کی بستی کے بزرگ نوجوانوں کو اس روشنی کے مینار کی خواہش سے خوف زدہ کرتے تھے اور شام ہی شام گھروں میں مقید کر دیتے تھے اور پھر صبح کے اجالے سے قبل گھروں سے باہر نکلنے پر پابندی ہوتی تھی۔ وہ اپنی بستی کے نوجوانوں کو اس طرح کی کوئی بات نہیں کہتا تھا۔ البتہ روشنی کی سمت مسافت کا راز اب بھی اس کے سینے میں دفن تھا اور اس نے کسی کو بھی ایک انجانے خوف کے باعث اپنا ہم راز نہ بنایا تھا اور پھر ایک روز اچانک اسے احساس ہوا۔ کہ بستی میں اس کی عمر کے جتنے بھی بزرگ تھے ان میں سے کوئی بھی اپنے پیچھے آنے والے نوجوانوں کو شام ہی شام اپنے گھروں میں مقید ہو جانے کی تلقین نہیں کرتا اور نہ ہی صبح اجالوں کے طلوع ہونے سے قبل گھروں سے نکلنے پر پابندی عائد کرتا ہے۔

(مارچ ۱۹۹۲ء)

☆☆☆

سنہری حروف

میں اس وقت جیسٹر نگ کراس میں شاہراہ قائد اعظم کے اس مقام پر کھڑا ہوں کہ میرے سامنے اسمبلی ہال کی دو منزلہ عمارت اپنے تمام تر جاہ و جلال کے ساتھ موجود ہے۔ اس کے موٹے دو منزلہ ستونوں سے استقامت جھلک رہی ہے اس کی جزوی ڈھلوان چھت سے گہرے تحفظ کا احساس ہوتا ہے مگر اس پر نظر پہنچنے سے قبل درمیان میں سمٹ مینار آ جاتا ہے جس کے چاروں طرف سرخ پتھر کے ڈھلوان بلاک اس طرح ایستادہ ہیں کہ ان کی ڈھلوانوں کا رخ سمٹ مینار کی اس جانب ہے جہاں وہ زمین سے اگا ہوا ہے۔ سمٹ مینار جہاں یکتائی و وحدانیت کے تاثر میں لپٹا ہوا ہے وہاں اس کے راتوں رات اُگ آنے کا احساس بھی ہوتا ہے حالانکہ اتحاد و یکتا ہونے کا جو درس سمٹ مینار سے ملتا ہے اس کے حصول کے لیے تو صدیوں کی جد وجہد بھی ناکافی ہوتی ہے۔ یہ فنِ تعمیر کا کمال ہے یا یہاں کی پُراسرار فضا کی مضبوط گرفت کہ عین اسمبلی ہال کے سامنے اتنا اونچا مینار دیکھ کر دونوں عمارتوں کے درمیان ایک غیر مرئی سا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔

اچانک میرا دھیان اس چھت کی طرف چلا جاتا ہے۔ جو سمٹ مینار کے قریب بائیں جانب ایستادہ ہے اور جسے چاروں کونوں سے چار ہاتھوں کی تین تین انگلیوں نے

سہارا دے رکھا ہے اور جو اس سرسبز و شاداب فضا کا ایک اہم حصہ بن کر رہ گئی ہے اور جس کے نیچے سنہری حروف میں لکھا ہوا قرآن محفوظ کر دیا گیا ہے۔

میں کئی کئی گھنٹے اس فضا کے سحر میں گرفتار رہا ہوں۔ شاہراہ قائد اعظم سے گزرتی بے شمار گاڑیوں کے دھویں اور ہارن کی آوازوں نے کبھی میری یکسوئی کو متاثر نہیں کیا۔ بلکہ بسا اوقات تو ان کے گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

شاہراہِ فاطمہ جناح سے آتے ہوئے اچانک ہی میں اس پُراسرار فضا کے سحر میں گرفتار ہو گیا تھا اور پھر گویا میرا معمول بن گیا۔ میں جب بھی ادھر سے گزرتا چند لمحے رک کر ضرور ان عمارتوں کی زبان سننے اور سمجھنے کی کوشش کرتا۔ جو خاموش چپ چاپ کھڑی ضرور کچھ نہ کچھ اپنی زبان میں کہہ رہی ہوتیں۔

کبھی تو عمارتیں انتہائی مغموم اور اداس نظر آتیں۔ ان کی آنکھوں میں چھلک آنے والے آنسوؤں کی نمی میں اپنے رخساروں پر محسوس کرتا۔ کبھی مجھے ان کے قہقہے سنائی دیتے۔ ہوا کے تیز جھونکے ان کی کھنک مجھ تک لے آتے اور کبھی یوں لگتا جیسے یہ عمارتیں کسی گہری سوچ میں گم مدتوں سے اس انتظار میں ہیں کہ شاید کوئی دانا و بینا آئے۔ جو ان کی زبان سمجھے اور ان کے محسوسات کو کوئی شکل دے سکے۔ میں جب بھی یہاں سے گزرا مجھے کسی نہ کسی پیغام کی سرگوشیاں ضرور سنائی دیں۔ مگر میں اپنی مصروفیات کے سبب کچھ زیادہ وقت ان کے درمیان نہ گزار سکا۔ ہاں البتہ میرے اور ان کے درمیان ایک رشتہ ضرور استوار ہو گیا ہے۔ دن میں ایک آدھ بار کسی نہ کسی بہانے میں ضرور ان کے درمیان سے گزرتا ہوں۔ سب عمارتیں اپنی اپنی زبان میں میرے ساتھ گفتگو کرتی ہیں۔

مجھے صحیح طرح سے یاد نہیں میں کب پہلی مرتبہ چند لمحوں کے لیے رکا تھا اور پھر یہ لمحے پھیل کر گھنٹوں پر محیط ہو گئے تھے۔ البتہ ان تمام چیزوں کے ساتھ میری خاصی انسیت ہو گئی تھی اور مجھے اپنا وجود بھی اسی فضا کا حصہ لگنے لگا تھا۔

ہاں تو میں شاہراہ قائد اعظم کے اس مقام پر کھڑا ہوں جہاں میرے سامنے اسمبلی ہال کی دو منزلہ عمارت ہے۔ جس کے سامنے سمٹ مینار اتحاد و یگانگت کی علامت کے طور پر اُبھرتا ہے۔ اور اس طرح ایستادہ ہے جیسے یہ بھی اسمبلی ہال کا ہی حصہ ہے۔ سمٹ مینار کے گرد ڈھلوان بلاکوں نے اپنے وجود نصف سے زائد زمین میں اتارے ہوئے ہیں۔ تاکہ دیکھنے والوں کو ان کے پیچھے اسمبلی ہال کی عمارت اپنے تمام تر جاہ وجلال کے ساتھ نظر آسکے۔

میرے دائیں طرف واپڈا ہاؤس کی ایک جدید طرز کی عمارت ہے۔ جس کی تعمیر کا زمانہ یقینی طور پر الفلاح سے بعد کا ہے۔ اسی وجہ سے یہ نسبتاً جوان اور اجلی نظر آتی ہے۔ سفید سیمنٹ میں پلستر کی ہوئی عمارت اگرچہ اپنا انفرادی تشخص رکھتی ہے۔ پھر بھی ارد گرد کی عمارتوں کے ساتھ اس کا تعلق محسوس ہوتا ہے۔ اور یہ بھی باقی عمارتوں کے ساتھ اس فضا کا حصہ معلوم ہوتی ہے۔ اس کے دو منزلہ اونچے ستون اس کو اسمبلی ہال کے ساتھ ملاتے ہیں۔ اور ان ستونوں پر کھدی ہوئی لکیریں اور سفید رنگت اس کا سمٹ مینار کے ساتھ تعلق جوڑتی ہے۔ واپڈا ہاؤس کے اوپر گنبد نما حصہ جس کی کھڑکیوں سے روشنی چھن چھن کر عمارت کے اندرونی وسطی حصے پر پڑتی ہے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے عمارت کو توقیر بخشنے کے لیے اس کے سر پر ٹوپی رکھ دی ہو۔

میرے بائیں ہاتھ پر الفلاح کی چھ منزلہ عمارت ہے۔ جس کو موسموں سے تحفظ دینے کے لیے افقی اور عمودی شیڈ بنائے گئے ہیں۔

واپڈا ہاؤس اور الفلاح بلڈنگ دونوں اسمبلی ہال کے ساتھ یکساں زاویہ بناتی ہیں عمر کے لحاظ سے دونوں میں فرق ہے۔ الفلاح ذرا ادھیڑ عمر ہے۔ یوں بھی اس میں مختلف انواع کی سر گرمیاں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ واپڈا ہاؤس نسبتاً جوان ہے۔ دونوں عمارتوں کے سامنے تکونی لان ہیں جہاں سبز گھاس بھی ہے اور اونچے اونچے درخت

بھی- دونوں عمارتیں زمانہ اور فنِ تعمیر ہر دو حوالوں سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں مگر پھر بھی مجموعی طور پر اس فضا کا حصہ معلوم ہوتی ہیں-

میری پشت پر شاہراہ فاطمہ جناح ہے- جس کے ایک طرف لاہور آرٹ کونسل کی عمارت ہے اور دوسری طرف شاہدین بلڈنگ ہے- عمر میں یہ سب سے بڑی ہیں- دونوں کا رخ ایک وقت میں ایک دوسرے کی جانب بھی ہے اور مرکزی نقطہ یعنی سمٹ مینار کی طرف بھی ہے- دونوں کے ظاہری خدوخال بھی ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہیں-

یہ تمام عمارتیں مل کر چیئرنگ کراس کی مجموعی طلسماتی فضا کو ترتیب دیتی ہیں جس کے سحر میں میں پچھلے کئی مہینوں سے گرفتار ہوں- اور دن کا کچھ حصہ ضرور ان کے درمیان گزارتا ہوں-

اب تو میں ان کی زبان سے بھی خاصا مانوس ہو گیا ہوں-

آج اس وقت جس کا میں ذکر کر رہا ہوں- میں شاہراہ قائداعظم کے اس مقام پر کھڑا ہوں- جہاں میرے سامنے اسمبلی ہال ہے میری دائیں جانب واپڈا ہاؤس ہے اور بائیں جانب الفلاح کی عمارت ایستادہ ہے میں اپنی اس احساساتی فضا میں شاید کبھی بھی کسی کو شامل نہ کرتا- مگر آج میرے لیے ایک مشکل پیدا ہو گئی ہے- موجودہ صورت حال کا تجزیہ کرنے سے میں قطعی طور پر قاصر ہوں- کتنی ہی دیر ہو گئی ہے مجھے یہاں کھڑے ہوئے--- میرے آگے پیچھے دائیں بائیں تمام شاہراہیں ویران ہیں- دور دور تک کسی قسم کی کوئی گاڑی نہیں ہے- اکا دکا کوئی گذر جاتا ہے تو میں اس کے پیروں کی چاپ سن کر آنکھیں کھول دیتا ہوں- میرے پردہ سماعت پر فوجی بوٹوں کی آواز خراشیں ڈال رہی ہے اور یہ خراشیں تکلیف دہ حد تک ناقابلِ برداشت ہیں- میرے لیے پریشانی کا باعث دراصل وہ فکرمندی اور اندیشے ہیں جو ان عمارتوں کے چہروں پر رینگ رہے ہیں-

جدھر بھی نگاہ اُٹھاتا ہوں ایک ہی سوال لٹکا ہوا ہے--- کچھ ہونے والا ہے۔ آج کچھ خلافِ معمول ہونے والا ہے۔ فوجی بوٹوں کی آواز اس خدشے کو اور بھی تقویت دے رہی ہے۔ شہر کی سڑکوں پر پیدا ہونے والی آواز کی بازگشت دور دور تک سنائی دیتی ہے۔مگر مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا کچھ سجھائی نہیں دے رہا۔

"میرے خدا کیا معاملہ ہے" اسی سوچ و پریشانی کے عالم میں میں اپنی بائیں جانب شاہراہ قائدِ اعظم پر دیکھتا ہوں۔ دور کہیں رنگ برنگے جھنڈے اور کپڑے کے بینر نظر آتے ہیں۔ اور پھر آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا--- آگے بڑھتا ہوا لوگوں کا ہجوم--- جو ہاتھ اونچے اونچے کرکے اپنی تمام تر توانائیاں صرف کرکے، چیخ چیخ کر نعرے لگا رہے ہیں۔

بہت سی آوازیں آپس میں گڈمڈ ہو رہی ہیں۔ میں اپنی دائیں جانب دیکھتا ہوں۔ تو دور مجھے ویسا ہی منظر دکھائی دیتا ہے۔ لوگ بڑھتے ہی چلے آرہے ہیں۔ آہستہ آہستہ......... آگے.........اور آگے۔ آخر ان لوگوں کے مسائل کیا ہیں نعرے کیا ہیں......... بینروں پہ کیا لکھا ہوا ہے۔ مگر فاصلہ اتنا زیادہ ہے کہ مجھے پتا نہیں چل رہا۔

میرے سامنے کھڑی عمارتیں بھی کچھ نہ کچھ جاننے کے لیے حسب استطاعت اپنی گردن آگے بڑھا رہی ہیں مگر بے جان عمارتیں اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتیں۔ مجھے پہلی مرتبہ ان کے بے جان ہونے کا احساس ہوا ہے۔ مگر اس سے قبل تو یہ عمارتیں ہمیشہ مجھے متحرک باتیں کرتی، ہنستی روتی اور گاتی محسوس ہوتی تھیں۔ مگر آج مجھے احساس ہوا کہ یہ عمارتیں تو اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں ہل سکتیں۔ کیوں کہ ان کی ذرا سی حرکت ان کو اپنے ہی قدموں پر گرا سکتی ہے۔ اور اسی خوف نے ان سے حرکت کی قوت سلب کرلی تھی۔

میں نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ تو شاہراہِ فاطمہ جناح پر بھی یہی منظر تھا۔ سامنے نظر پڑی تو اسمبلی ہال کی دونوں بغلوں سے چیختے ہوئے نعرے اور جھنڈے نظر آنے

لگے۔ چاروں طرف لوگ ہی لوگ تھے اور فلک شگاف نعرے ہی نعرے سنائی دے رہے تھے۔

جوں جوں جلوس قریب آتے گئے۔ چیزیں واضح ہوتی گئیں اور نعرے سمجھ میں آنے لگے کہ اس سارے عمل اور رد عمل کے اصل محرکات کیا ہیں۔

ایک طرف سے کان میں آواز پڑی "ہم سندھی ہیں" تو دوسری طرف "ہم پنجابی ہیں" میرے آگے بلوچی اور پیچھے پٹھانوں کا ہجوم چلا آ رہا تھا.......... سب چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے.......... ہماری زبانیں مختلف ہیں.......... ہماری نسلیں مختلف ہیں.......... ہمارے لباس مختلف ہیں.......... رہن سہن کے اطوار مختلف ہیں.......... لباس کے رنگ مختلف ہیں.......... ہمیں اپنے مفادات کا تحفظ دو.......... ہمارا مقدر محض جھلساتی ہوئی دھوپ نہیں.......... ہمارے حصے کی بارش دوسروں کی زمینوں کو سیراب کرتی ہے.......... ہمارے حصے کی چھاؤں ہمارے لیے ناکافی ہے.......... ہمیشہ ہم سے ہمارے حقوق چھینے گئے ہیں.......... ہم ہم ہیں.......... ہمارا اپنا تشخص ہے.......... ہماری اپنی تہذیب و ثقافت ہے.......... ہمارے درمیان صرف اختلافات ہیں.......... پھر ہم کیسے اکٹھے رہ سکتے ہیں.......... ہمارے خون کی رنگت کا ایک ہونا.......... ہمارے مذہب کا ایک ہونا.......... زندگی کے نصب العین کا ایک ہونا.......... ہمیں یکتا و اکٹھا نہیں رکھ سکتا۔ یہ محض فریب ہیں۔ جو ہمارے حقوق پر غاصبانہ قبضے کے لیے ہمیں دیئے گئے ہیں۔ اب اور دھوکہ ناقابل برداشت ہے آوازیں لحہ بہ لحہ آ رہی تھیں اور یہ آوازیں اتنی قریب اور اتنی اونچی ہو گئیں کہ مجھے اپنے کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔

میں نے انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں اور آنکھیں بند کر لیں۔ ہجوم چوک میں آ کر ٹھہر گیا تھا مگر آوازوں کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ عجیب سا خوف میرے اوپر مسلط ہو گیا۔ اور میں سہم گیا۔ اب میری آنکھوں کے سامنے یہی عمارتیں تھیں اور

کانوں میں ان کی سر گوشیاں۔

سب سے پہلے الفلاح مخاطب ہوئی۔ میں رقبے میں تمام عمارتوں سے بڑی ہوں۔ میرے اندر ہر طرح کی سہولتوں کی فراوانی ہے۔ میں کسی کی محتاج نہیں ہوں۔ گرمیوں کی تپتی دوپہروں میں میرے جنوب اور مغرب کے رخ جلتے رہتے ہیں مگر ان معمولی مسائل کے باعث میں نے کبھی علیحدگی کا تصور نہیں کیا۔

شاہدین اور لاہور آرٹ کونسل کی عمارات گویا ہوئیں۔ عمر کے اس حصے میں ہمیں سہارے کی زیادہ ضرورت ہے۔ استقامت کے لیے زیادہ توانائی چاہیے۔ اور یوں بھی ہم مرکزی سرسبز و شاداب حصے سے دور سارا دن دھوپ میں جلتی رہتی ہیں۔ مگر ہماری بقاء اور عظمت اسی میں ہے کہ ہم یہیں کھڑی اپنا تشخص برقرار رکھتے ہوئے اس مجموعی فضا کا حصہ بنی رہیں۔

واپڈا ہاؤس جو نسبتاً کم عمر اور کم تجربہ کار تھی دھیمے لہجے میں بولی میں سب سے زیادہ جوان اور زور آور ہوں۔ میری شکل و شباہت بھی نمایاں اور ٹانگوں میں بھی بے شمار توانائی ہے مگر میں نے کبھی بھی علیحدگی کے بارے میں سوچا تک نہیں۔

اسمبلی ہال کی عمارت کے جاہ و جلال میں اچانک ڈھیر ساری شفقت اور محبت عود آئی۔ اس نے تمام عمارتوں کو آفرین کہا اور نہایت تحمل سے گفتگو کا آغاز کیا۔ "تم سب میں اختلافات اپنی جگہ موجود ہیں۔ تمہارے ظاہری رنگوں میں اختلافات ہیں۔ بنیادی عمارتی ساز و سامان میں اختلافات ہیں تمہارے درمیان عمروں کا تفاوت موجود ہے۔ کچھ عمارتوں کو دن کے مختلف اوقات میں شدید موسمی اثرات کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ حجم کے لحاظ سے قد کے لحاظ سے بھی تفریق موجود ہے مگر ان سارے تفرقات کے باوجود تم سب کے اندر انفرادی تشخص کے بجائے اجتماعی تشخص کو بحال و قائم رکھنے کا جذبہ موجود ہے۔ اور یہی وہ احساساتی سرمایہ ہے۔ جس نے تم سب کو اکٹھا رکھا ہوا ہے۔ اور تمہارے اس اجتماع نے ہی تمہیں انسانوں کی اس بستی میں ایک نمایاں

مقام دے رکھا ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں زبان عطا کرنے کی بجائے اجتماعی شعور سے نوازا ہے۔ جس کی روشنی میں ہم نے ضابطۂ حیات کے زریں اصولوں کا تعین کیا ہے۔ اور یہی ہمارے تشخص اور زندہ ہونے کی علامت وضمانت ہے"

اسمبلی ہال کا آخری جملہ سن کر میرا دھیان ان سنہری حروف کی طرف چلا گیا جو اس چھت کے نیچے پڑے تھے جس کے چاروں کونوں کو چار ہاتھوں کی تین تین انگلیوں نے اُٹھا رکھا تھا۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ اور اس چھت کی جانب دیکھا۔ جس کے نیچے سنہری حروف پڑے تھے۔ مگر اونچے اونچے بانسوں اور ان میں ٹنگے ہوئے بینروں نے ان کو اپنے پیچھے چھپا لیا تھا۔ اور میرے بازو نہ تو اتنے لمبے تھے اور نہ ہی اتنی توانائی کے حامل۔ کہ میں ان بینروں کو پرے ہٹا کر لوگوں کو ان سنہری حروف کی طرف متوجہ کر سکتا۔

(اگست ۱۹۹۰ء)

☆☆☆

پوری بات ادھوری

یہ وہ دن تھے جب جنگ نے تمام ملک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور محاذوں پر ہی نہیں بلکہ دیہاتی اور شہری علاقوں پر سے بھی جنگی جہاز گزرتے تو آگ کا ایک جنگل بچھا جاتے۔

تمام لوگ بچوں سے لے کر لاٹھی ٹیکتے ہوئے بوڑھوں تک ایک عجیب قسم کی سرشاری کی کیفیت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ یہ اپنی جانوں کے تحفظ کا مسئلہ تھا یا شاید حق و باطل کی جنگ کا شعوری احساس۔ پتہ نہیں کیا تھا۔ تمام قوم پوری طرح اس کی لپیٹ میں آئی ہوئی تھی۔

علی اٹھارہ سال کا ایک نوجوان لڑکا تھا۔ محاذ کے قریب ہی ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ تین روز قبل آرمی کی ایک جیپ آئی تھی۔ جس پر سوار آرمی کے نوجوانوں نے لاوڈ سپیکر پر علاقے بھر میں اعلان کیا تھا۔ کہ جتنی جلدی ممکن ہو گاؤں چھوڑ دیا جائے۔

اور آج تین دن بعد نصف سے زائد گاؤں خالی ہو چکا تھا۔ مگر علی کا باپ ابھی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ کہ اسے آج شام نکل جانا چاہیے یا کل صبح سویرے۔ منہ اندھیرے۔ پتہ نہیں کیا چیز تھی جس نے اسے ابھی تک روک رکھا تھا۔ شاید اسے اس معجزے کا انتظار تھا کہ صبح اٹھتے ہی اسے پتہ چلے گا کہ محاذ سے آرمی واپس اپنی بیر کوں

میں چلی گئی ہے اور اب کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں۔ شام بھی جب وہ کھیتوں سے لوٹا تھا تو ہوا کے دوش پر لہراتی ہوئی خوشوں بھری فصلیں اسے بہت معصوم لگیں اور وہ بھی اسی معصومیت سے ہنس پڑا تھا، ان لہلہاتی فصلوں کی بے خبری پر کہ جنہیں یہ احساس ہی نہیں تھا کہ ان کو کاشت کرنے والے توانا ہاتھ ان کو کاٹ نہیں سکیں گے۔

شام ہو رہی تھی۔ اور علی ابھی تک واپس نہیں لوٹا تھا۔ علی کی ماں اب تو دروازے سے ہی لگ کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ کتنی دفعہ دروازے تک جا کر لوٹی تھی۔ مگر لحہ بہ لحہ ڈھلتے ہوئے دن نے اس کی آنکھوں کو عجیب قسم کے واہموں اور شکوک و شبہات کی گرفت میں لے لیا تھا۔

پچھلے تین دنوں سے علی ذہنی طور پر فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب بھی جنگی جہاز فضا کو چیرتے ہوئے گزرتے تو ایک عجیب قسم کی لہر اسے اپنے رگ و پے میں اُترتی ہوئی محسوس ہوتی اور ایک عجیب قسم کی توانائی اور لذت سے اسے اپنا نوخیز جسم ٹوٹتا ہوا محسوس ہوتا۔ پھر اس کی ٹانگوں میں یک دم حرکت آجاتی اور وہ دوڑ کر اپنے گھر کی چھت پر چڑھ جاتا اور جب تک جہاز نظر آتے وہ انہیں دیکھتا رہتا اور جب جہاز دور کہیں فضا میں گم ہو جاتے تو اس کی نظر محاذ کی جانب اٹھ جاتی۔ وہ محاذ پر فوجی جوانوں کو لڑتے ہوئے حملہ کرتے ہوئے اور دشمن کو پچھاڑتے ہوئے دیکھتا تو اس کے تمام جسم میں ایک سنسناہٹ دوڑ جاتی۔ مگر یہ سب تو اس کو خیال ہی خیال میں نظر آتا۔ کیونکہ محاذ اس کے گاؤں سے کئی کوس کے فاصلے پر تھا۔ یہ تیسرا روز تھا۔ جب وہ صبح ہی صبح اٹھا اور ناشتہ کرنے کے بعد کھیتوں کے بہانے گھر سے نکل گیا۔ کھیتوں سے پرے جا کر اس نے فوجی وردی پہنی جو اس کے بڑے بھائی کیپٹن ارسلان کی تھی۔ جو ملکی دفاع کے لیے کہیں محاذ پر گیا ہوا تھا۔ وہ ماں کی آنکھ بچا کر یہ وردی لایا تھا۔ پہلے تو اس نے ہاتھ سے اس کی سلوٹیں کم کرنے کی کوشش کی اور پھر پہن کر تن کر کھڑا ہو گیا، اور ایک تنقیدی نظر خود پر ڈالی۔ ایک لذت انگیز توانائی کی لہر اسے اپنے بازوؤں میں چلتی ہوئی

محسوس ہوئی اور اسی لذت و سرشاری میں اس کے قدم محاذ کی جانب اٹھنے لگے۔

آج تک اس نے جنگ کے بارے میں سنا تھا۔ مگر اپنی آنکھوں سے جنگ ہوتے ہوئے نہیں دیکھی تھی۔ اس نے کتنے ہی خاکے سوچے تھے مگر ہر خاکہ وہ خود ہی مسترد کر دیتا۔ "بھلا جنگ اس طرح تھوڑا ہوتی ہے" اور پھر نئے زاویئے سے اس کے بارے میں سوچنے لگتا۔ جوں جوں فاصلہ طے ہو رہا تھا۔ اس کے قدموں میں تیزی آ رہی تھی۔ رگوں میں خون کی گردش تیز ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ اور اب تو اس نے بازو بھی پورے جوش سے چلانے شروع کر دیئے تھے۔ بالکل فوجی جوانوں کی طرح۔ کہ جب وہ پریڈ کرتے ہوئے ایک قوت سے بازو چلاتے ہیں، اور ایک دوسرے کے ساتھ بازو اور پاؤں ملاتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ بس فوجیوں کو اس نے اسی حد تک دیکھا تھا۔ پتہ نہیں ہر فوجی کے چہرے پر اس کے بھائی کا چہرہ کیوں ابھر آتا تھا۔

وہ مسلسل چلتا رہا اور گردو پیش میں حد نگاہ تک دیکھتا رہا۔ مگر اسے کہیں بھی جنگ کے آثار نظر نہ آئے۔ البتہ کبھی کبھار کوئی ایک آدھ فوجی جیپ یا فوجی ٹرک گزر جاتا۔ تو کافی دیر تک فضا میں گرد معلق رہتی۔ اس گرد میں اسے مختلف شکلیں نظر آتیں۔ بہت سارے آرمی کے جوان خاکی وردیاں پہنے محاذ آرائی میں مصروف نظر آتے۔ مگر یہ اتنی دیر ہی ہوتا جتنی دیر گرد فضا میں معلق رہتی۔ جب فضا صاف ہو جاتی تو پھر حدِ نگاہ تک سوائے درختوں اور جھاڑیوں کے کچھ نظر نہ آتا۔

علی نے آج تہیہ کیا ہوا تھا کہ جیسے بھی ممکن ہو وہ ضرور جنگ کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ کر لوٹے گا۔ اور اگر ممکن ہوا وہ بھی ضرور اس میں حصہ لے گا۔ مگر جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ مایوسی بڑھتی جا رہی تھی۔ بلکہ اب تو اسے فوجی جیپ میں بیٹھے اعلان کرنے والوں پر بھی شک ہونے لگا تھا۔ کہ وہ جھوٹ بول رہے تھے۔

وہ گاؤں سے بہت دور نکل آیا تھا۔ مگر ابھی تک دور دور جہاں تک نگاہ دیکھ سکتی

تھی کہیں بھی جوان نظر نہ آرہے تھے۔ کم از کم گولیاں چلنے کی آواز تو آنا چاہیے تھی۔ مگر ہر طرف ایک خاموشی تھی۔ ہاں البتہ کبھی کبھار کوئی پرندہ درخت سے اڑجاتا۔ تو اس کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ تھوڑی دیر کے لیے اس خاموشی کو توڑ دیتی۔

علی مسلسل آگے بڑھتا رہا۔ ایک آدھ بار اسے ماں کا خیال بھی آیا۔ کہ وہ فکر مند ہو گی۔ مگر پھر یہ سوچ کر کہ جب وہ اپنی آنکھوں سے دیکھی ہوئی جنگ کے واقعات سنائے گا۔ تو ماں اس کی بہادری پر اسے خوب شاباش دے گی۔ البتہ اسے بابا کا ڈر تھا کہ وہ اسے ضرور ڈانٹے گا۔

دور درختوں کی قطار نظر آئی۔ تو اسے یوں لگا۔ جیسے آرمی کے جوان قطار اندر قطار جنگ کے منتظر ہیں۔ مگر قریب جا کر اسے پتہ چلا کہ یہ تو محض نہر کے کنارے اگے ہوئے درخت ہیں۔ وہ نہر کے کنارے پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں طرف دور دور تک کہیں پُل نہیں تھا۔ کہ جس سے نہر پار کر کے دوسرے کنارے تک جایا جا سکے۔ اس نے ایک سمت میں سفر بھی کیا کہ شاید پل آجائے مگر قریب قریب کہیں بھی پل نظر نہیں آرہا تھا۔

اب جو نہر میں پاؤں لٹکا کے تھوڑی دیر بیٹھا تو اسے احساس ہوا کہ تھکاوٹ سے اس کا جسم چُور ہے اس نے نہر کے پانی میں نظر آنے والے درختوں کے عکس کو دیکھا اور ایک کنکر پھینکا تھوڑی دیر کے لیے اس جگہ پر درختوں کے عکس ٹوٹ پھوٹ گئے۔ مگر پھر دوبارہ جڑ گئے۔ اسے یہ کھیل بہت دلچسپ لگا۔ درختوں کے عکس کا ٹوٹنا اور پھر آپ ہی آپ جڑ جانا اور پانی کی سطح کا یوں ہو جانا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ بہت دلچسپ کھیل تھا۔

علی کے گھر سے نکلنے کے کچھ ہی دیر بعد گاؤں سے باہر ایک فوجی ٹرک آکر رکا۔ چار جوانوں نے ٹرک کا پچھلا دروازہ کھولا اور انتہائی احترام سے ایک صندوق باہر نکالا اور

اسے اتنے ہی وقار سے اٹھا کر کیپٹن ارسلان کے گھر کی جانب چلنے لگے۔
باہر گلی میں لحہ بہ لحہ بڑھتی ہوئی فوجی بوٹوں کی آواز سن کر کیپٹن ارسلان کی ماں باہر ڈیوڑھی تک آئی اور صندوق دیکھ کر ایک لحہ میں سارا معاملہ اس کی سمجھ میں آگیا۔ ارسلان کا والد تو کمال ضبط کا انسان تھا۔ اس نے صندوق کو خود ہی سہارا دے کر گھر کے صحن میں ایک چارپائی پر رکھا۔ البتہ ارسلان کی ماں کی آنکھوں سے چند آنسو نکلے اور رخساروں پر سے راستہ بناتے ہوئے خاکی زمین میں جذب ہو گئے۔
ساڑھے تین گھنٹے کے بعد جب ٹرک میں بیٹھ کر فوجی جوانوں نے آخری نگاہ گاؤں پر ڈالی۔ تو اس زمین پر کیپٹن ارسلان کا نشان محض مٹی کی ایک ڈھیری کی شکل میں رہ گیا تھا۔ شام کے بڑھتے ہوئے سائے اور بھی لمبے ہوتے چلے گئے اور علی کی ماں کے خدشات اور بھی تنومند ہو کر اس کے گھر کے صحن میں ناچنے لگے۔ وہ پہلے تو برآمدے سے صحن میں آئی اور پھر ڈیوڑھی سے لگ کر بیٹھ گئی۔
ابھی اندھیرا اتنا نہیں پھیلا تھا۔ کافی فاصلے تک چیزیں صاف نظر آرہی تھیں۔ جب علی گلی کا موڑ کاٹ کر اپنے گھر والی گلی میں داخل ہوا۔
خاکی وردی میں ملبوس علی کو دیکھ کر اس کی ماں کو یوں لگا۔ جیسے ارسلان آرہا ہو۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دھیان ارسلان کی طرف چلا گیا۔ ہر مرتبہ الوداع ہوتے ہوئے وہ ماں سے مذاق ہی مذاق میں کہتا تھا۔ "ماں۔ آخری بار مل لو۔ پھر کیا پتہ تم اپنے بیٹے کو گلے بھی لگا سکو گی یا نہیں۔ اور وہ یہ سوچ کر ہنس دیتی کہ پاگل اس طرح کی بات محض ڈھیر سارا پیار لینے کے لیے کرتا ہے۔ مگر اسے کیا پتہ تھا کہ وہ واقعی سچ کہتا تھا۔ کہ وہ اس سے گلے بھی نہ مل سکے گی اور بس صندوق پر لگے شیشے میں سے صرف اس کا چہرہ ہی دیکھ سکے گی۔
علی اس اثنا میں بالکل پاس آچکا تھا۔ اس نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔
"ماں فوجی جیپ میں اعلان کرنے والے آرمی کے جوان جھوٹ کہتے ہیں کہ سرحدوں پر جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ جلدی جلدی گاؤں خالی کر دیں۔ میں آج نہر تک ہو کے آیا

ہوں مگر مجھے کہیں بھی جنگ تو کیا آرمی کے جوان بھی نظر نہیں آئے۔۔۔۔۔۔

ہاں ماں میں بالکل سچ کہتا ہوں۔۔۔۔۔۔ میں خود نہر تک ہو کے آیا ہوں۔۔۔۔۔۔

علی کی ماں تو زبان سے کچھ نہ بولی۔ اس نے اسے لپٹا لیا۔ اور خوب پیار کرنے لگی۔ البتہ اس کے والد کے منہ سے صرف اتنا نکلا "بیٹا جنگ دیکھنے کے لیے محاذ پر جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ تو خود چل کے ہمارے گھروں تک آجاتی ہے۔"

"جنگ خود چل کے ہمارے گھروں تک آ جاتی ہے۔" اس نے اس کے بارے میں بہت سوچا مگر بات سمجھ میں نہ آئی۔ اس نے ماں سے بھی پوچھا مگر وہ بھی اس کی تسلی نہ کر سکی۔ بلکہ وہ تو منہ سے بھی کچھ نہ بولی۔ البتہ اس دن کے بعد سے وہ روزانہ ریلوے اسٹیشن جاتا ہے اور شہر سے آنے والی آخری گاڑی تک منتظر رہتا ہے اسے پورا یقین ہے کہ جب اس کا بھائی کیپٹن ارسلان گھر آئے گا۔ تو وہ ضرور اس بات کی وضاحت کر سکے گا کہ جنگ کیسے چل کر ہمارے گھروں تک آ جاتی ہے۔"

(۶- ستمبر ۱۹۹۰ء)

☆☆☆

دیوار پہ لٹکا ہوا آدمی

اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹے ہوئے عام طور پر جو دیوار میری آنکھوں کے سامنے رہتی ہے اس پر ایک درمیانے سائیز کا پوسٹر آویزاں ہے۔

پوسٹر کیا ہے۔ بس سیاہ اور سفید رنگ کے باہمی تضاد سے ایک تاثر ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پہلی نظر دیکھنے سے پوسٹر کے منعکس کردہ مفہوم تک رسائی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

پوسٹر پر بیلوں کی ایک جوڑی ہے اور ایک کسان ہے جس نے ہل جوتا ہوا ہے۔ بڑی عام فہم اور عمومی سی تصویر ہے اور یقیناً جب میں نے اسے خریدا تھا تو میرے لاشعور کے کسی گوشے میں اس کے مفاہیم پنہاں ہوں تو مجھے خبر نہیں۔ البتہ جس قدر معنی خیز اور فکر انگیز یہ پوسٹر اب ہو گیا ہے۔ یقیناً پہلے ایسا نہیں تھا۔

میں نے ایم اے اکنامکس فرسٹ پارٹ میں جب داخلہ لیا تھا۔ تو ہاسٹل میں یہ کمرہ مجھے ملا تھا۔ ضروری سامان کو کمرے میں مختلف جگہیں دینے کے بعد یہ دیوار رہ گئی تھی۔ میں یہاں پوسٹر لگانے کے بارے میں ہر گز نہ سوچتا اگر اس سے پہلے یہاں تصویر نہ لگی ہوتی۔ جانے والے نے جب وہ تصویر اتاری تھی تو کچھ جگہوں سے ڈسٹمپر اکھڑ گیا تھا۔ جو بہت بد نما لگتا تھا اور اس مسئلے کا جو حل میرے ذہن میں فوری طور پر آیا تھا۔ وہ

یہی تھا کہ یہاں کوئی پوسٹر لگا دیا جائے۔

لہٰذا اسی شام میں انار کلی جا پہنچا۔ اب تو انار کلی کے ابتدائی حصے سے تجاوزات ہٹا کر سڑک کو کھلا کر دیا گیا ہے اور پارکنگ کے لیے کافی جگہ نکل آئی ہے۔ شروع میں یہاں روز مرہ استعمال کی چھوٹی موٹی اشیاء بیچنے والوں کے علاوہ لنڈے کی پینٹس اور شرٹس کے ساتھ پوسٹرز کی بھی خرید و فروخت ہوتی تھی۔

جس روز میں پوسٹر لینے گیا تھا۔ میرے ذہن میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ بلکہ خیال تھا کہ کوئی قدرتی منظر کوئی خوبصورت آبشار یا پھر کسی شہر کا معروف چوک۔۔۔۔ ان میں سے کوئی مناسب چیز یہاں آویزاں کی جا سکتی ہے۔

مجھے صحیح طرح یاد نہیں ہے کہ وہ کیسا لمحہ تھا یا اس وقت میرے ذہن میں کیا خیال آیا کہ میں نے یہ پوسٹر خریدنے کا فیصلہ کیا تھا۔

بہر حال نئی نئی کلاسز شروع ہوئی تھیں اور اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ اِدھر اُدھر کہیں اور دھیان جاتا اور پھر کچھ لوگوں سے شناسائی ہو گئی اور یوں کلاس میں چند ایک لوگوں کے ساتھ بات شناسائی سے آگے بڑھ کر دوستی تک آن پہنچی۔

میرے یہ دوست وقتاً فوقتاً کمرے میں آتے رہتے تھے اور انہی دوستوں میں سے ایک نے میری اور باقی دوستوں کی توجہ اس پوسٹر کی طرف مبذول کرائی تھی۔ ویسے تو عام سا ایک منظر تھا۔ جو کسی بھی گاؤں میں رہنے والے کے لیے کوئی ایسا قابلِ توجہ نہ تھا۔ دراصل اس کھیل میں دلچسپی کی وجہ یہ تھی کہ پوسٹر میں پیش کیے جانے والے کردار واضح نہ تھے اور ان کے خدوخال کی وضاحت کے لیے باقاعدہ ان کی طرف متوجہ ہونا پڑتا تھا اور وہ حصے جو بظاہر نظر نہ آتے تھے۔ ان کو قوتِ خیال سے پوسٹر پہ منتقل کرنے کے عمل میں ایک عجیب سی لذت محسوس ہوتی تھی۔

بہر کیف یہ پوسٹر میری اور میرے دوستوں کی توجہ کا مرکز بنتا چلا گیا اور ہم سب دوستوں کی یکساں توجہ کے باعث نئے نئے مفاہیم نئی نئی وضاحتوں کے ساتھ

دریافت ہوتے چلے گئے اور پھر ایک وقت ایسا آیا۔ جب سب لوگوں کے لیے یہ محض ایک عام سا پوسٹر بن کے رہ گیا۔

مگر میرے لیے اس مرحلے پر اس کے نئے مفاہیم کھلنے شروع ہو گئے۔ میں کمرے میں جب بھی بیڈ پر لیٹتا۔ میری نظر اس پر جا ٹکتی اور کئی کئی لمحے میں اس منظر کو زندہ جاوید محسوس کرتا۔ آہستہ آہستہ مجھے زندگی کے تمام روپ اس پوسٹر میں جھلکتے محسوس ہونے لگے۔ بیلوں کے باہمی تعاون اور کسان کے ہل چلانے کا عمل مجھے زندگی سے بہت قریب لگنے لگا۔ کبھی کبھی تو یہ درمیانے سائیز کا پوسٹر پھیل کر میرے پورے کمرے کو اپنی فضا میں لپیٹ لیتا اور میرے کمرے سے مٹی کی خوشبو آنے لگتی۔ جیسے ابھی ابھی ہل چلایا گیا ہو۔

کسان کی مستقل مزاجی اور مشقت نے مجھے مسلسل محنت اور ریاضت کا درس دیا۔ جوں جوں یہ مفاہیم مجھ پر کھلے۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کتابوں سے باہر نکل کر حقیقی دنیا میں قدم رکھ رہا ہوں۔ مجھے زندگی کے نشیب و فراز کی سمجھ آنے لگی ہے۔

اور پھر تو باقاعدہ میں نے اس کی تبلیغ شروع کر دی۔ میرے دوستوں میں سے جب بھی کوئی میرے کمرے میں آتا تو میں اس کی توجہ اس جانب ضرور دلاتا، مگر اکثر و بیشتر مجھے تمسخر کا نشانہ بننا پڑتا اور میری بات پر کوئی کان نہ دھرتا۔

مجھے یہ تصویر عمل اور حرکت کا احساس دلاتی۔ زندگی کو درپیش پہاڑ جیسے مسائل کا نہ صرف احساس دلاتی بلکہ ان کا سامنا کرنے کا حوصلہ بھی عطا کرتی۔ میں اس تصویر کو دیکھ کر کچھ کر گزرنے کے ولولے دل میں کروٹیں لیتے ہوئے محسوس کرتا۔ میرے خون کی گردش تیز ہو جاتی اور مٹھیاں بھینچ کر بہت کچھ کر گزرنے کے پروگرام بنا ڈالتا۔

میں نے بارہا چاہا کہ دوستوں کو بھی اس کیفیت میں شامل کر سکوں۔ مگر وہ کبھی بھی اس بہاؤ میں نہ بہہ سکے۔ اس پوسٹر کو دیکھ کر کبھی بھی ان کے چہروں پر کچھ کر گزرنے کے تاثرات نہ پیدا ہوئے۔

فرسٹ پارٹ میں جب میں نے ٹاپ کیا۔ تو اپنے آپ کو اپنے خوابوں کی تعبیروں کے بہت قریب پایا اور میں نے اسی جوش و خروش میں سیکنڈ پارٹ کا امتحان دے ڈالا۔ کمرہ خالی کرنے کا وقت آیا۔ تو میں نے جہاں دیگر اہم اشیاء کو سمیٹا۔ وہاں اس پوسٹر کو بھی دیوار سے اتارا اور اپنے سامان میں رکھ لیا

اور پھر میری زندگی کا اہم دور شروع ہوا۔ مجھے وہ پہلا دن یقیناً اگلے کئی برسوں تک بھی نہ بھولے گا جب میں شیو بنا رہا تھا اور اپنی زندگی کا پہلا انٹرویو دینے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ میرے کمرے کی دیوار پہ وہی پوسٹر لگا ہوا تھا اور شیو بناتے ہوئے میری نظر اس پر پڑ جاتی تو رگوں میں خون کی گردش اور بھی تیز ہوتی ہوئی محسوس ہوتی۔

اور پھر ایک سے دوسرا تیسرا اور پھر بیسیوں انٹرویو دے ڈالے۔ ہر انٹرویو پہلے دن کے سے جوش و خروش سے تیار ہو کر دینے کے لیے جاتا۔ مگر واپسی پر پاؤں سو سو من وزنی ہو جاتے۔ گھر تک پہنچنا مشکل ہو جاتا۔ پتہ نہیں انہیں کس طرح کا شخص درکار ہوتا تھا۔ میں کسی ایک کے معیار پر بھی پورا نہ اترا۔

مگر اس کے باوجود یہ پوسٹر ہر مرتبہ از سر نو میری ہمت بندھاتا اور ایک نئی آس کا دیپک جلاتا۔ ہر مرتبہ مجھ میں پہلے دن کا سا حوصلہ اور عزم پیدا ہو جاتا۔ مگر کب تک۔۔۔۔۔ آخر کب تک ایسا ہوتا۔

آہستہ آہستہ تمام خواب ٹوٹنے شروع ہوئے۔ شکست و ریخت کا یہ عمل کب شروع ہوا اس کے بارے میں لائن کھینچنا ممکن نہیں۔ عجیب عجیب احساسات نے میرے اعصاب کو اپنی گرفت میں لینا شروع کر دیا اور پھر تو یوں ہونے لگا۔ کہ میں انٹرویو دینے سے ہی لاپرواہی برتنے لگا۔ اس کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک دلیل میرے پاس موجود تھی۔ ہر انٹرویو کا نتیجہ مجھے پہلے سے ہی معلوم ہوتا۔

وقت گزارنے کے لیے میں نے ایک پرائیویٹ سکول میں ٹیچنگ شروع کر دی تھی صبح کے چند گھنٹے جو سکول میں گزرتے۔ وہ تو ایسے تیسے کٹ جاتے۔ مگر سکول سے

واپس گھر آ کر وقت کاٹنا پہاڑ کاٹنے کے مترادف ہو جاتا۔ کئی کئی گھنٹے تک سگریٹ پہ سگریٹ سلگائے بیڈ پر پڑا رہتا۔ سامنے دیوار پر ٹنگی تصویر بھی اب تو اپنا مفہوم کھو بیٹھی تھی۔

پتہ نہیں اس عمل میں کتنے مہینے گزر گئے۔۔۔۔ کتنے سال گزر گئے اور یا پھر شاید کئی صدیاں گزر گئیں۔

اور پھر ایک روز زوردار چھنا کا ہوا۔ پوسٹر پر سیاہ و سفید کے تضاد سے پیدا کیا جانے والا تاثر ایک مرتبہ پھر معنی خیز ہو گیا۔ البتہ اب اس کا مفہوم بدل گیا تھا۔ بیلوں کی جوڑی جو باہمی یگانگت اور تعاون کی علامت تھی۔ یک دم یوں محسوس ہونے لگا جیسے یہ بیل اپنے گلے میں پنجالی ڈالے زمین کا سینہ چیرتی ہل کو کھینچنے کے لیے پابند ہیں اور بہر صورت انہیں یہی کرنا ہے۔ کسان جس کے چہرے سے عزم وارادے کی لو پھوٹتی تھی یک دم بے بس اور لاچار سا نظر آنے لگا۔ جیسے وہ اس عمل کو ابھی اور اسی وقت چھوڑ دینا چاہتا ہے۔ مگر کوئی غیر مرئی قوت۔۔۔ یا خلا میں گھورتی ہوئی دو خوفناک آنکھیں اسے مجبور کر رہی ہوں۔ وہ اپنے ارد گرد اگ آنے والی ضرورتوں کو کاٹنے کے لیے مسلسل ہل چلا رہا ہے۔ مگر اس دھرتی کا سینہ چیر کے بھی وہ ناکام و نامراد رہتا ہے۔

پوسٹر کے اس بدلتے ہوئے مفہوم نے مجھے اعصابی طور پر بہت لاغر اور توڑ پھوڑ کے رکھ دیا تھا۔ وہی تصویر جو کبھی دل میں کچھ کر گزرنے کے ولولے بیدار کرتی تھی۔ جسے دیکھ کر رگوں میں خون کی گردش تیز ہو جاتی تھی۔ اس تصویر کو دیکھ کر اب میں لاغر اور پیلا ہوتا جا رہا تھا۔

اور پھر پتہ نہیں وہ کون سا لمحہ تھا۔ جب میں نے پوسٹر کی جگہ دیوار پر اپنے آپ کو لٹکا ہوا محسوس کیا۔ حیرت سے میری آنکھیں پھٹ پڑیں بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ میں چارپائی پر لیٹے ہونے کے بجائے دیوار پر ایک بے جان پوسٹر کی طرح لٹکا ہوا ہوں۔

مگر دو چار بار اپنی پلکیں جھپکنے کے بعد مجھے یقین کرنا پڑا کہ میں واقعی دیوار پر ٹنگا ہوا ہوں اور میرا بیڈ بالکل خالی پڑا ہے۔ جیسے کسی کے آنے کا منتظر ہو۔ جو آ کر میری طرف توجہ دے گا اور میرے بکھرے ہوئے غیر واضح خدوخال کو اپنی توجہ اور یکسوئی سے پوری جسامت بخشے گا۔

(ستمبر ۱۹۹۰ء)

☆☆☆
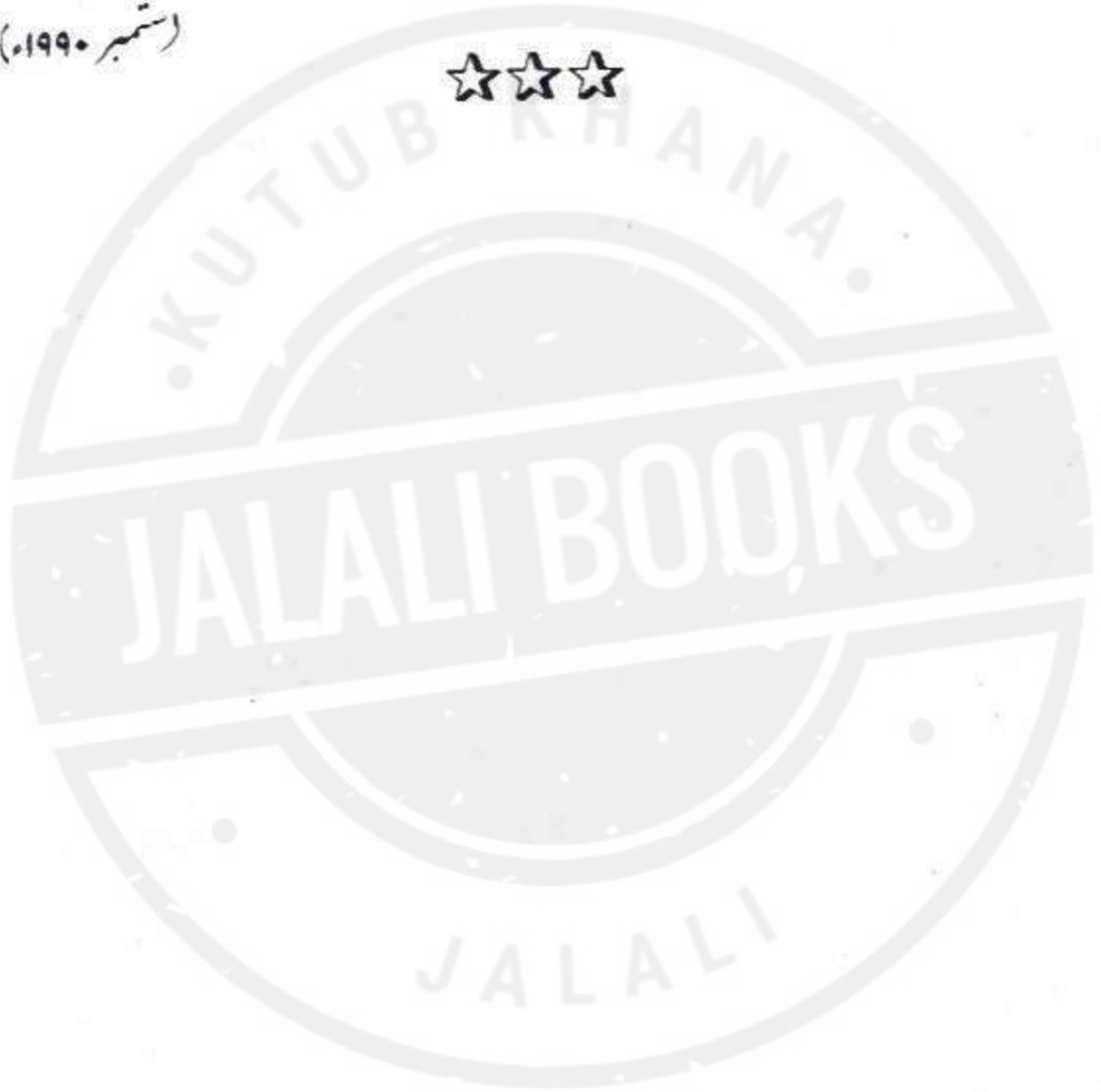
گلی کا موڑ

بڑی سڑک سے اُتر کر گلی کا موڑ کاٹنے سے قبل میں نے پیچھے مڑ کر اس کی طرف دیکھا وہ وہیں تھی ٹیرس پر ریلنگ کے قریب ایزی چیئر پر بیٹھے ہوئے۔ اور اس نے نگاہیں سامنے کھیل کے میدان پر ٹکائی ہوئی تھیں۔ جہاں شام محلّے کے بچے کھیل کود کے لیے اکٹھے ہو جاتے تھے۔

دو کنال کے احاطے میں واقع اس کی کوٹھی اب بھی بڑی رعب دار لگتی تھی کیونکہ ارد گرد محلّے کے چار چار چھ چھ مرلوں پر بنے جزوی طور پر پختہ مکانوں کی حیثیت ہی کیا تھی محلّے کے لوگ اسے کوٹھی والی بیگم صاحب کہتے تھے۔ البتہ اس کا اصل نام بیگم الماس تھا اس وقت ہم لوگ بہت چھوٹے تھے، میں پرائمری کی کسی جماعت میں پڑھتا تھا۔ جب ان لوگوں نے محلّے سے باہر یہ جگہ خریدی تھی۔ اس وقت یہ زمین کھلے میدان کی طرح غیر آباد پڑی ہوئی تھی۔ زمین خریدنے کے بعد جلد ہی ان لوگوں نے یہ کوٹھی تعمیر کروائی تھی۔ اس وقت تک سامنے سے پختہ سڑک بھی نہیں گزرتی تھی۔ مگر جب سامنے پختہ کھلی سڑک بن گئی کوٹھی کا بیرونی منظر اور بھی رعب دار ہو گیا۔

کئی برس گزر جانے کے باوجود آج بھی ان لوگوں کے محلّے والوں کے ساتھ کوئی خاص تعلقات نہیں بن سکے۔ اس کی ایک وجہ تو یقیناً یہی تھی کہ دونوں طرف سے کبھی

کوشش ہی نہ ہوئی تھی۔ اور یوں سٹیٹس کا فرق ہمیشہ قائم رہا۔ محلے کی ہی کوئی نہ کوئی عورت مختلف وقتوں میں اس کوٹھی کے مکینوں کے ہاں ملازمت کرتی رہی۔ جس کے باعث ان کے بارے میں تھوڑا بہت علم ہوتا رہتا۔

ہم لوگ اس وقت بہت چھوٹے تھے۔ اور کوٹھی سے ملحقہ گراؤنڈ میں کھیلتے تھے۔ پہلے پہل جب کوٹھی تعمیر ہوئی تھی تو اس کے گرد چار دیواری نہ تھی۔ جس کی وجہ سے ہم لوگوں کو کوٹھی کے ایک طرف کھیلنے کے لیے جگہ مل جاتی تھی۔ اب جہاں کھیل کا میدان ہے وہاں کبھی پانی کا جوہڑ ہوتا تھا۔ سکول سے آنے کے بعد شام محلے کے بچوں کی ایک ہی مصروفیت ہوتی تھی۔ اور وہ یہ کہ اس میدان میں کوئی نہ کوئی کھیل کھیلتے رہتے۔ جب کوٹھی کے مکینوں نے یہ جگہ خرید کر ایک حصے میں کوٹھی بنا لی تو بھی محلے کے بچوں نے یہ کھیل کود جاری رکھی۔

پہلے پہل تو کوٹھی والوں کا نوکر آ کر منع کر جاتا تھا کہ شور نہ کریں پھر یوں ہوا کہ بچوں کو سختی سے کھیلنے سے منع کر دیا گیا، مگر چونکہ اور کوئی جگہ نہ تھی اس لیے مجبوراً بچے پھر ادھر ہی اکٹھے ہو جاتے۔

کوٹھی کے مکینوں نے اس مسئلے کا حل یہ نکالا کہ اپنے احاطے کے گرد چار دیواری کھڑی کر دی۔ اور یوں محلے کے بچوں کے کھیلنے کے لیے اب کوئی جگہ نہ بچی۔ میں نے شروع سے ہی ان کوٹھی والوں کے بارے میں ذرا مختلف انداز میں سوچا تھا۔ معلوم نہیں کیوں۔ اس چار دیواری کی تعمیر نے تو میرے اندر اور نفرت بو دی تھی۔ میں دل سے مانتا تھا کہ یہ احاطہ چونکہ کوٹھی والوں کی ملکیت تھا لہذا چار دیواری ان کا حق بنتا تھا مگر پتا نہیں کیوں کوئی میرے اندر چیختا تھا کہ یہ چار دیواری صرف اس لیے بنائی گئی ہے کہ محلے کے بچے یہاں آ کر نہ کھیلیں۔ اس احساس کی وجہ صرف یہ ایک بات نہ تھی گئی اور اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں جنھوں نے مل کر مجموعی طور پر ایک بڑی نفرت کو جنم دیا تھا۔

ان دنوں محلّے کے قریب ایک ہی اسکول تھا جس میں محلّے کے بچے بھی پڑھتے تھے اور کوٹھی والوں کے دو بچے بھی تیسرا ابھی چھوٹا تھا۔ ان میں سے بڑا لڑکا تو میرا ہم جماعت تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ کلاس میں سب سے آگے بیٹھتا تھا اور میں پیچھے۔ کلاس ٹیچر کا رویہ اس کے ساتھ اور میرے ساتھ قطعی مختلف تھا اور یوں جو فاصلہ محلّے میں رہتے ہوئے قائم تھا۔ ایک ہی کلاس میں پڑھتے ہوئے بھی وہ فاصلہ بدستور قائم رہا اور نفرت کا بیج پھلتا پھولتا رہا۔

صبح جب اسکول جانے کے لیے میں محلّے کے دیگر بچوں کے ساتھ بستہ اٹھائے نکلتا تو کوٹھی کے سامنے ایک تانگے والا موجود ہوتا۔ جو کوٹھی والوں کے بچوں کو اسکول لے جاتا اور لے آتا۔ بچے صرف دو تھے اور پورا تانگہ۔ کئی بار تو میں نے سوچا، کہ چلو میرا بستہ ہی تانگے میں رکھ کر لے جائیں۔ مگر ایسا کبھی نہ ہوا۔ اپنے بوجھ اپنے سروں پر اٹھائے محلّے کے چند لڑکے کالج میں داخل ہوئے تو ان میں ایک میں بھی تھا اور کوٹھی والوں کا بڑا بیٹا بھی۔

اور یہی وہ دن تھے جب کوٹھی کی رونق میں اضافہ ہوا تھا۔ محلّے کی ملازمہ کے توسط سے پتا چلا کہ ان کے ڈیڈی آئے ہیں۔ یہ ڈیڈی لندن سے آئے تھے اس اطلاع نے ہمارے درمیان فاصلوں کی خلیج اور بھی بڑھا دی۔ اور جب ڈیڈی گئے تو جاتے ہوئے دونوں بڑے بیٹوں کو بھی تعلیم کے سلسلے میں ساتھ لے گئے۔ اب صرف چھوٹا رہ گیا تھا۔ جو ابھی پرائمری سے نکل کر ہائی سکول میں قدم رکھ رہا تھا۔ محلّے کی ملازمہ نے ہی بتایا کہ بہت جلد اسے بھی ڈیڈی ساتھ لے جائیں گے۔ ابھی چونکہ بیگم صاحبہ اکیلی تھیں اس لیے چھوڑ گئے ہیں میں نے گریجویشن کے بعد ایک مقامی دفتر میں ملازمت اختیار کر لی۔ کہ اب نہ صرف مجھے گھر کی کفالت میں ہاتھ بٹانا تھا بلکہ اپنا بوجھ بھی خود ہی اٹھانا تھا اور اسی دوران میں نے ایم اے کر لیا۔ اور یوں ایک بہتر دفتر میں ملازمت مل گئی جہاں میرا اپنا کمرہ تھا میز تھی اور کرسی تھی اور یہ احساس میرے لیے اطمینان بخش تھا۔

میں محلے کے اسی مکان میں اپنی ماں بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہتا ہوں۔ میرا بڑا بیٹا محلے کے اسی پرائمری سکول میں پڑھتا ہے۔ جہاں کبھی میں پڑھتا تھا۔ فرق صرف اتنا پڑا تھا کہ اب اسکول کی عمارت کی دیواریں اور فرش پختہ ہیں اسکول کا ایک گیٹ ہے اور اس پر اسکول کا نام لکھا ہوا ہے اور یہ سب پہلے نہیں ہوتا تھا۔ پرائمری سکول کے بعد ہائی سکول میں داخل ہو جانے پر میں سوچ رہا ہوں کہ اسے سائیکل لے کر دوں گا۔ کوٹھی والی بیگم کے تینوں بیٹے پڑھ لکھ کر بڑے افسر بن چکے ہیں۔ بڑے لڑکے نے انجینئرنگ کی تھی اور وہ ملک میں ہی ایک دوسرے شہر میں اسٹنٹ ڈائریکٹر ہو گیا ہے۔ اس سے چھوٹا لندن میں ہی ملازمت کرتا ہے۔ جبکہ سب سے چھوٹا بیٹا سرجن ہے۔ پاکستان میں رہنا چاہتا تھا مگر چند مہینوں کے بعد اچانک ہی وہ لندن واپس چلا گیا اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ تینوں بھائیوں کی شادیاں خوب ٹھاٹ باٹ سے ہو چکی ہیں۔

محلے والوں نے تو صرف چھوٹے بیٹے کی شادی کے ٹھاٹ دیکھے تھے۔ باقی دونوں کی شادیاں پتا نہیں کہاں ہوئیں اور کیسے ہوئیں لیکن یقیناً ٹھاٹ باٹ سے ہوئی ہوں گی۔

زندگی کی شاہراہ پر بیگم الماس اکیلی رہ گئی ہیں۔ دو سال ہوئے ہارٹ اٹیک نے ان کے خاوند کو ہمیشہ کے لیے ان سے جدا کر دیا۔ اور ان کے بیٹے جو کامیاب ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں اپنے اپنے گھروں میں خوش باش ہیں اور کوٹھی والی بیگم صاحبہ روزانہ ٹیرس پر ریلنگ کے قریب ایزی چیئر پر بیٹھ جاتی ہیں اور انتہائی انہماک سے اس کھیل کے میدان کی طرف دیکھتی رہتی ہیں جہاں بچے کھیل کود میں مصروف ہوتے ہیں جن میں میرا بڑا بیٹا عرفان بھی شامل ہے۔

ابھی ابھی میرے بیٹے نے مجھے بتایا ہے کہ اس مرتبہ کوٹھی والی بیگم صاحبہ نے انھیں فٹ بال خرید کر دیا ہے اور کہا ہے کہ آئندہ بھی جب انھیں نئے فٹ بال کی ضرورت پڑے تو آکر اس سے کہہ دیں۔"

یہ الفاظ مجھے چونکانے کے لیے کافی ہیں۔ میرے اندر ایک لمحے کے لیے نفرت کا شدید احساس جنم لیتا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ عرفان کو فٹ بال کھیلنے سے منع کر دوں۔" مگر پھر یہ سوچ کر چپ رہ جاتا ہوں کہ بیگم الماس کھیلتے ہوئے بچوں میں اپنے بچوں کا بچپن تلاش کرتی ہیں جو انھوں نے اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے کہیں راستے میں گنوا دیا تھا۔ یہ احساس مجھے روکتا ہے کہ میں وہ نفرت جو میرے دل میں پروان چڑھی ہے۔ اسے اپنے بیٹے عرفان کے دل میں نہ بوؤں کہ وہ ساری زندگی اس لپیٹ میں رہے گا۔

ہاں --- اتنا ضرور ہے کہ جب میں گلی کا موڑ کاٹتا ہوں تو اس سے پہلے ایک بار ضرور پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں۔ مجھے اگرچہ علم ہے کہ وہ ٹیرس پر ریلنگ کے قریب ایزی چیئر پر بیٹھی انہماک سے میدان میں کھیلتے ہوئے بچوں کو دیکھ رہی ہوگی۔ موڑ مڑنے سے قبل آخری مرتبہ دیکھ کر میرے اندر ایک عجیب سا لذت انگیز احساس سر سرانے لگتا ہے اور میں عجیب سا اطمینان اور خوشی محسوس کرتا ہوں۔

(اپریل ۱۹۹۱ء)

فن کار

اسے ہمیشہ سے یہ گلہ رہا ہے کہ لوگ اس کی مہارت اور صلاحیتوں کو جاننے میں بہت دیر کر دیتے ہیں اتنی دیر کہ جب اس کا دِل کام کرنے سے اکتانے لگتا ہے تو لوگوں تک اس کے کام کی مہارت کا شہرہ پہنچتا ہے اور وہ باوجود ان کے اصرار کے بھی اپنا پیشہ تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے، کہ یہی اطمینان کی ایک صورت نظر آتی ہے۔

اس نے کسی تدریسی ادارے سے نہ تو کسی خاص شعبے میں تعلیم حاصل کی تھی اور نہ ہی کسی تکنیکی ادارے سے کوئی کام سیکھنے کا باقاعدہ ڈپلومہ حاصل کیا تھا۔ اس کے باوجود بقول اس کے اس نے جس کام پر بھی توجہ دی اپنی مسلسل محنت اور لگن سے بہت کم عرصہ میں اس نے اس میں خاطر خواہ مہارت حاصل کر لی اور اس مخصوص شعبہ میں استاد کا درجہ پایا کہ یہی وقت کی سند قرار پائی ہے۔

اس کا والد گاؤں میں منجی پیڑھی ٹھونکنے کا کام کرتا تھا۔ بہت بھولا بھالا، ناک کی سیدھ میں سفر کرنے والا اور سفر بھی ایسا کہ دائیاں پاؤں اٹھے تو بائیں کو خبر نہ ہو اور بائیاں پاؤں اٹھے تو اس کی دھول دائیں پاؤں پر نہ پڑے اس قدر سادہ کہ اس نے کبھی گھر سے دوکان اور دوکان سے گھر آنے جانے کے علاوہ مہینوں تک کچھ اور نہ کیا، کہیں

اور نہ گیا۔

کہتے ہیں کہ کبھی کوئی گاہک اس سے مایوس نہیں گیا جب بھی کوئی مسئلہ لے کر آیا تو اس کے والد نے اس کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکالا، لوگوں کو اس کے بارے میں یہی علم تھا اس کے علاوہ اس کی شخصیت کا کوئی پہلو بھی کھلا ہوا نہیں تھا کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اس کے علاوہ اس کی شخصیت میں کچھ تھا ہی نہیں دوکان کا مالک اگرچہ بہت ہوشیار آدمی تھی مگر گاؤں کی محدود ضرور توں والی فضا میں رہنے کے باعث اس کے دل میں خدا ترسی بھی بھری ہوئی تھی

کتنے ہی سال بیت گئے اس کے والد کو منجھی پیڑھی ٹھونکتے ہوئے، اس نے کبھی ناغہ نہیں کیا تھا۔ وہ کبھی بیمار نہیں ہوا تھا مالک کو یاد پڑتا تھا کہ شاید ہی کبھی اس نے دوکان سے چھٹی کی تھی یا کام کرنے میں لاپرواہی یا کام چوری کا مظاہرہ کیا تھا البتہ اس کے کام کرنے کی اپنی ایک رفتار تھی۔ جو زمانوں سے نہ تو کم ہوئی تھی اور نہ ہی زیادہ،عید سعید کے موقع پر اگر مالک اسے دو چار دن کی اجرت بونس کے طور پر دے دیتا تو بھی اس کے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہ آتی تھی اس کی آنکھوں میں کبھی پسند یا ناپسندیدگی کی کوئی لہر نہیں اٹھتی تھی۔

حتیٰ کہ اپنے بیٹے کی پیدائش پر بھی اس کے شب و روز میں کوئی تبدیلی نہ آئی وہ تو کئی دن بعد مالک کو پتہ چلا تو اس نے خود ہی مٹھائی منگوا کر ارد گرد کے دوکانداروں کو اطلاع پہنچائی تھی کہ اس کا ایک اور ملازم بھی باپ بن گیا ہے۔

اس کے والد کے گھر آنے کا ایک مخصوص وقت تھا۔ شام مغرب کی اذان سے اتنا پہلے کہ وہ گھر پہنچ کر اطمینان سے اپنے سر کی پگڑی اتار کر چارپائی پہ ایک طرف رکھ دیتا۔ اس کی بیوی اس کے لیے پانی کا کٹورا لے آتی پانی پی کر وہ چند لمحے اطمینان کا سانس لیتا۔ بازو اوپر چڑھاتا اور وضو کے لیے بیٹھ جاتا۔ بعض اوقات وضو کے دوران اور بعض اوقات وضو کر چکنے کے بعد مغرب کی اذان ہو جاتی اور وہ گھر کے قریب ہی محلے کی

جامع مسجد میں نماز پڑھنے چلا جاتا۔

واپس گھر پہنچنے پر کھانا تیار ہوتا، اور وہ حسبِ خواہش چند لقمے لے کر دستر خوان سے اُٹھ جاتا۔ کیا پکا ہے، مرچ یا نمک تیز ہے یا کم ہے اس نے کبھی اِس کا اظہار نہیں کیا تھا۔

موسموں کی تبدیلی کے ساتھ شام غروب کا وقت بدلتا رہتا تھا مگر اس کی مصروفیت کا جو تعلق سورج کے غروب ہونے کے ساتھ بن گیا تھا اس میں کبھی کوئی قابلِ ذکر تبدیلی نہ آئی تھی۔

اس پدری معاشرے میں ملا جلا کر یہی کل رول تھا جو اس کا والد تب سے کرتا آ رہا تھا جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا۔ گزرتے ہوئے وقت کا احساس صرف سفید ہوتے ہوئے بالوں سے ہو سکتا تھا کہ جب شام اس کا والد پگڑی اتار کر چارپائی پر رکھتا۔ وگرنہ اپنے والد کے چہرے کے نقوش میں ہونے والی کسی قسم کی تبدیلی کو وہ محسوس نہ کر سکا۔

ایسے گھر میں پرورش پانے والے بچوں کا مستقبل زیادہ سے زیادہ جو ہو سکتا ہے وہی اس کا ہوا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد جب اس کے ہاتھ بازو مضبوط ہوئے تو والد کے ساتھ دوکان پر جانے لگا۔

دوکان پر جانے کا سلسلہ بھی بالکل غیر محسوس طریقے سے شروع ہوا تھا۔ اول اول وہ گرمیوں کی دوپہروں میں والد کے لیے کھانا لے کر جاتا تھا۔ پھر اس میں تسلسل آ گیا اور وہ نہایت باقاعدگی سے دوکان پر والد کی مدد کے لیے جانے لگا۔

دوکان پر اور کاریگر بھی تھے مگر اس کے والد کی شخصیت ان سب سے مختلف تھی مستقل خاموشی نے جہاں اس کو بے شمار مسائل سے محفوظ رکھا ہوا تھا وہاں دیگر کاریگروں پر ایک طرح کا غیر مرئی سا رعب بھی قائم تھا۔

ایک دن دوکان کا مالک خدا جانے کس ترحم کے موڈ میں تھا اس نے اس کے

والد کو منجھی پیڑھی ٹھونکنے والے کام سے اُٹھا کر چار پائیوں کے پائے بنانے والے کام پر لگا دیا۔ ترقی کے زینے کا یہ واحد مرحلہ تھا جو اس کے والد نے طویل مشقت کے بعد طے کیا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ایسا ہو گیا تھا۔ اگر پائے بنانے والا کاریگر دوکان چھوڑ کر چلا نہ گیا ہوتا تو شاید یہ بھی نہ ہوتا۔

بہر حال چند دن کی محنت کے بعد اس کے والد نے درست پائے بنانے شروع کر دیئے اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ اس کے والد کے بنائے ہوئے پائیوں کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا۔ بڑے بڑے زمیندار اور جاگیردار بیٹیوں کے جہیز کے لیے رنگلے پائے اس کے ہاتھ کے بنے ہوئے ہی پسند کرتے۔ اس کے علاوہ دودھ بلونیاں اور دیگر گھریلو سامان جہاں گول مشین پر ترشے ہوئے اور نیلے سرخ اور پیلے رنگوں میں رنگے ہوئے پائے استعمال ہوتے تھے وہ اس کے والد کے ہاتھ کا ہی شاہکار ہوتے تھے۔

جب اس نے والد کے ساتھ دوکان پر باقاعدہ بیٹھنا اور ہاتھ بٹانا شروع کیا تھا تو اس وقت تک اس کے والد کا شہرہ دور دور تک پہنچ چکا تھا اور علاقے میں اس کے والد کے فن کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا تھا۔

اور یہی وہ دن تھے جب اسے احساس ہوا تھا کہ مالک نے اس کے والد کو جانے میں بہت دیر کر دی تھی۔ اگر کئی سال پہلے مالک اس کے والد کو یہ موقع فراہم کر دیتا۔ تو بہت پہلے اس کا والد اس مقام پر پہنچ گیا ہوتا اور اب تک مزید کئی منازل طے کر چکا ہوتا۔

یہی وہ احساس تھا جس نے آکٹوپس کی طرح اس کو چاروں اور سے اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور بتدریج گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔

جلد ہی اس نے والد کے ساتھ پائے بنانے شروع کر دیے تھے۔ اور بہت جلد وہ مہارت اور سپیڈ ہر دو حوالوں سے والد سے بہت آگے نکل گیا تھا۔ لکڑی کا ٹکڑا مشین پر چڑھا کر جب وہ اسے گھماتا تھا تو بڑے اعتماد اور کمال مہارت سے انگلیوں کا استعمال کرتا۔ اس کی آنکھ کا زاویہ اتنا تیز اور درست ہوتا کہ بغیر پیمائش کے ہی پائیوں کی

گولائیاں اور کناریاں اتنی درست ہوتیں کہ آدھے سوت کا بھی فرق نہ پڑتا اور اسی صلاحیت نے اس کے کام کی رفتار میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔

مگر جلد ہی اس کام سے اس کا جی بھر گیا اس کی وجہ تو اسے سمجھ نہیں آئی البتہ زندہ رہنے کے لیے جتنے عوامل اثر انداز ہوتے ہیں وہ ذاتی طور پر ان کی بے معنویت کا شکار ہو گیا تھا اور یہیں سے بے زاری اور بددلی کی جڑیں پھوٹنا شروع ہوئیں۔

دوکان کے مالک نے بہت اصرار کیا معاوضے کی بھی بہتر پیش کش کی۔ مگر اس کے ایک جملے کے بعد مالک کا اصرار ختم ہو گیا۔ اس نے صرف یہ کہا تھا کہ اس کا دل نہیں چاہتا، نہ صرف یہ بلکہ کوئی بھی کام کرنے کو اس کا جی نہیں مانتا۔

مگر یہ کیفیت چند دنوں کی فراغت تک ہی محدود تھی البتہ اب اس نے فرنیچر بنانا شروع کر دیا تھا کہتے ہیں کہ جسے ایک بار لکڑی کی خوشبو کی لت پڑ جائے تو پھر وہ اس سے زیادہ عرصہ دور نہیں رہ سکتا شاید یہی وجہ ہو اس کے فرنیچر کی طرف لوٹنے کی۔ بہت تھوڑے سے عرصے میں وہ فرنیچر کی دنیا میں (یہ دنیا اس کے گرد و پیش میں واقع چند گاؤں تک ہی محدود تھی) ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اس نے علاقے کے اثر و رسوخ والے خاندانوں کے گھروں میں نت نئے ڈیزائن پہنچا کر خاصی شہرت حاصل کر لی تھی اور علاقے کے لوگوں کے گھروں میں شاید ہی کوئی ایسا گھر ہو جہاں اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی کوئی چیز نہ ہو۔

لکڑی کو چھیلنے اور رندہ لگانے سے پہلے ہی وہ اس کی سطح پر بننے والے لہریوں کو پہچان لیتا تھا وہ ہر کرسی میز شوکیس میں لگنے والی لکڑی پر اُبھرنے والے ریشوں کا ایسا انتخاب کرتا۔ دیکھنے والوں کی طبیعت خوش ہو جاتی تھی۔

علاقے میں جو فرنیچر بنتا تھا اس میں مختلف انواع کی گلکاریاں ہوتی تھیں مگر اس کے ہاتھ سے بننے والا فرنیچر بہت سادہ مگر بہت دلکش ہوتا تھا۔ وہ اکثر کہتا لکڑی کا اپنا ہی اتنا حسن اور دلکشی ہے کہ اس پر ہونے والی یہ گلکاریاں کسی طور مناسب نہیں لگتیں۔ وہ

فرنیچر میں استعمال ہونے والی لکڑی کے کناروں پر اور اس کے تناسب میں ہی پتہ نہیں کیا جادو جگا دیتا کہ آنے والا کچھ نہ کچھ ضرور خرید لے جاتا۔

مگر اس سارے عمل میں اسے کئی سال لگ گئے۔ اس کے اندر ایک مستقل بے چینی نے گھر کر لیا تھا۔ لوگ یقیناً میری مہارت اور فن کو جاننے اور سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اور جب وہ سمجھنے لگیں گے اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہو گی۔

یہی وہ احساس تھا جس نے اسے کئی دنوں سے ڈسٹرب کیا ہوا تھا۔ اور اس کا جی اچاٹ ہوتا جا رہا تھا۔

ایک روز شاید انہی سوچوں میں غلطاں بیٹھا فرنیچر بنا رہا تھا۔ جب اس کی انگلی کٹ گئی۔ اس نے دوسرے ہاتھ کے انگوٹھے سے کٹے ہوئے زخم کو دبایا اور پنساری کی دکان کی طرف چل پڑا۔ اور پھر وہ کبھی اپنی ورکشاپ میں نہیں گیا۔ وہاں اب بھی اس کا شاگرد کام کرتا تھا۔

کئی ہفتے گزر گئے تھے۔ انگلی کا زخم بھی مندمل ہو چکا تھا۔ مگر نشان مستقل رہ گیا تھا۔ سارا سارا دن وہ اپنے دوست کی مٹھائی کی دوکان پر بیٹھتا۔ سارا دن خوب گپ شپ ہوتی۔ سیاست کے اتار چڑھاؤ اور مفادات کی سودے بازیوں پر خوب بحثیں جمتی۔ مگر یہ سب اس وقت تک تھا جب تک الیکشن نہیں ہوئے تھے۔ الیکشن ہونے کے بعد عوام کے منتخب نمائندگان حلف برداری کی تقریب سے فارغ ہو کر اپنے لیے آئین کے مطابق وزیرِ اعظم کا انتخاب کر چکے تھے۔ اگلے چند ہفتوں کے بعد ہی سیاسی موضوعات پر گرما گرم بحث ٹھنڈی ہونا شروع ہو گئی اور حکومتی سرگرمیاں معمول پر آ گئیں۔

اب جو فرصت ملی تو دھیان مٹھائی کی طرف چلا گیا اور وہیں دوست کی دوکان پر ہی مٹھائی بنانے لگا۔ اس کی مسلسل محنت اور نت نئے تجربات کی عادت نے یہاں بھی اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا۔ اور پھر علاقے میں جہاں بھی خوشی کا موقع آتا۔ چار لوگ مل بیٹھتے، تو اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی مٹھائیوں کی لذت کا ذکر ضرور ہوتا۔

ساتھ ہی ایک سائیکل والے نے دوکان چھوڑی تو اس نے کرائے پر لے لی اور پھر آزادانہ طور پر اپنا کام کرنے لگا۔

ارد گرد کے سبھی گاؤں تک اس کا شہرہ پہنچا۔ جہاں پر بھی شادی و مسرت کا لمحہ ہوتا اس کو ضرور یاد رکھا جاتا۔ بلکہ ایسے مواقع کے لئے خصوصی طور پر مٹھائیاں بنوائی جاتیں۔ اسی طرح اس نے مختلف نوعیت کے تجربات کے بعد جو نئی نئی مٹھائیاں بنائی تھیں تو خود ہی ان کے الٹے سیدھے نام رکھنا شروع کر دیئے تھے۔ مثلاً برفی اور کھوئے کو ملانے سے اس نے ایک تیسری چیز بنائی تھی جس کا نام اس نے "برکھویا" رکھا تھا۔ اس کی شکل بظاہر تو برفی کی ٹکیوں کی طرح ہوتی تھی۔ مگر دونوں ذائقے علیحدہ علیحدہ محسوس ہوتے تھے اور کھانے والے کو اندازہ نہ ہو پاتا تھا کہ اگلا نوالہ برفی کا ہے یا کھوئے کا۔ اسی طرح سردیوں کے موسم میں وہ اس میں گاجر کا حلوہ مکس کر دیتا تھا۔ اس کا ایک الگ اپنا ذائقہ بن جاتا۔ اس کے ٹکڑے نسبتاً بڑے کئے جاتے تھے اور اس کا نام اس نے گجرفی رکھا ہوا تھا۔ گجرفی کی رنگت میں کہیں کہیں گاجر کی سرخی اس کو دیکھنے میں بھی پُرلطف بنا دیتی تھی۔

جلیبی کا خاص موسم ہوتا تھا۔ خصوصاً جب میلوں ٹھیلوں کے دن ہوتے تھے وہ تمام تر سازوسامان کے ساتھ میلے کے مقام پر شفٹ ہو جاتا اور تازہ تازہ جلیبی میلے کے شائقین کی خدمت میں پیش کرتا اور جس روز کبڈی ہوتی یا دنگل ہوتا وہ روز تو اس کی دیہاڑی کا انتہائی آمدن والا دن ہوتا تھا۔ لوگوں نے اب کی بار اس کو اور اس کی مٹھائیوں کو خوب خوش آمدید کہا تھا اور اسے مناسب وقت کے بعد ہی شہرت اور عزت ملنا شروع ہو گئی تھی۔ مگر پھر بھی جانے کیوں اس کا جھکاؤ بیکری کی اشیاء کی طرف ہو گیا۔ تازہ تازہ بند جب وہ تیار کرتا تو دس دکان دائیں اور دس دکان بائیں تک اس کی میٹھی میٹھی خوشبو جاتی تھی۔ بسکٹوں کے ڈیزائن میں تو اس نے انتہا ہی کر دی تھی۔ شکل اور ذائقے، ہر دو حوالوں سے ایسی ایسی خوش ذائقہ اور لذت انگیز چیزیں آٹے

میدنے سے بنا ڈالیں۔ کہ کھانے والا ایک بار ہاتھ بڑھا لے تو پھر ہاتھ رکتا نہیں تھا اور اگر ایک نظر دیکھ لے تو کھائے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔

ایک دن اخبار میں کیک بنانے کی ترکیب پڑھ لی۔ اسی روز کیک بنا ڈالا۔ پہلا پہلا کیک تھا۔ بندہ چونکہ سمجھدار تھا اور اجزائے ترکیبی کے ملانے کے حساب کتاب سے واقف۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پہلا پہلا کیک ہی بہت امید افزاء رہا۔ اس نے ساتھی دوکانداروں کو ایک ایک ٹکڑا دیا۔ اور سب نے بڑی تعریف کی۔ اس کے بعد کیا تھا کیک کی وسیع دنیا میں جو آگے بڑھا تو بڑھتا ہی چلا گیا۔

ایک روز ایک گاڑی والے صاحب کیک لینے آئے۔ تو واپسی پر ان کی گاڑی خراب ہو گئی۔ بڑی کوشش کی مگر اسٹارٹ نہ ہوئی۔ وہ صاحب دوبارہ دوکان پر آئے اور اسے کہنے لگے کہ گاڑی کا خیال رکھنا میں ابھی مکینک کو لے کر آتا ہوں، اس نے ایک لمحہ کے لئے سوچا، اور ان کے ساتھ ہی باہر نکل آیا۔ گاڑی کا بونٹ کھول کر اندر دیکھا تو تاروں اور کل پرزوں پر مشتمل ایک بالکل ہی مختلف دنیا اس کی منتظر تھی۔ تاریں ادھر اُدھر کر کے اس نے محض ان کو چھونے کی خواہش پوری کی۔ وہ صاحب جب مکینک کو لے کر آئے تو اس نے بھی گاڑی کے انجن میں اپنا سر جھکا دیا۔ سمجھ تو اسے کچھ نہ آئی۔ البتہ ایک خواہش نے اس کے پاؤں روک لئے اور اس نے وہیں کھڑے گاڑیوں کی مرمت کا کام سیکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

چند ہفتے کام کرنے کے بعد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ ایک حد ہے جس کے آگے اس کے استاد کا علم بھی ختم ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے تجسس اور دن رات کی محنت نے اس کے سامنے گاڑی کے کل پرزوں کے بہت سارے معاملات واضح کر دیئے۔

لہذا جلد ہی وہ اس مقام پر آن پہنچا کہ پٹرول اور ڈیزل سے چلنے والے انجن موٹر سائیکل، ٹریکٹر گاڑی، غرض کچھ بھی ہوا گر وہ اس تک پہنچ جاتا تو پھر مرمت ہوئے بغیر واپس نہ جاتا تھا۔

کام پر گرفت بہت آہستہ آہستہ آئی اور یوں رفتہ رفتہ لوگوں کا اس پر اعتماد قائم ہونا شروع ہو گیا۔ گاؤں میں تو ایسی کوئی خاص گاڑیاں وغیرہ تھیں نہیں۔ البتہ سڑک سے گزرنے والی گاڑیاں، پک اپ سوزوکی، ٹریکٹر، موٹر سائیکل والے اس کے گاہک تھے۔ کام آگے بڑھ رہا تھا مگر سست روی کے ساتھ۔ مگر اس کی سمجھ بوجھ بہت تیزی سے مختلف مراحل طے کر رہی تھی۔

مگر وہ جو اس کو گلہ تھا کہ لوگ اسے سمجھنے اور جاننے میں بہت دیر کر دیتے ہیں۔ بلکہ ان تک اس کا شہرہ تب پہنچتا ہے جب وہ اس کام سے اکتانے لگتا ہے۔ بس ایک بات تھی جو اس کے دماغ میں بیٹھ گئی تھی۔ دراصل یہ احساس اس بے چینی اور اضطراب کے بطن سے پھوٹا تھا جس کی تسکین کے لیے وہ اپنے آپ کو مختلف کاموں میں الجھائے رکھتا اور ہر گتھی سلجھانے کے بعد اسے ویسی ہی خوشی نصیب ہوتی جیسے ایک ریاضی دان کو ایک کلیہ معلوم کر کے یا پھر جیسے ایک فن کار کئی فن پارے بنانے کے بعد ایک ایسا فن پارہ بناتا ہے کہ جو باعث تسکین ہوتا ہے، اگرچہ یہ اطمینان بھی عارضی ہوتا ہے اور پھر اگلے ہی کسی لمحے فن کار اسی ازلی تڑپ اور بے چینی کے ہاتھوں بے بس ہو چکا ہوتا ہے۔

اس نے اپنے بیٹے کی پیدائش پر مٹھائیاں اپنے ہاتھ سے بنا کر بانٹی تھیں

اس نے اپنی بہن کے جہیز کا فرنیچر خود اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ اس کی لکڑی کے انتخاب کے لیے اس نے بڑی بڑی لکڑ منڈیاں وزٹ کیں کئی موقعوں پر لکڑی کو چِرا کر اس کی خوشبو سونگھی کٹے ہوئے تختوں پر بنے والے لہریوں کو دیکھا اور کئی ہفتوں کی خواری کے بعد اس کو اپنی مطلوبہ لکڑ مل سکی اور پھر وہ کئی ہفتوں کے لیے ورکشاپ میں ٹک کر بیٹھ گیا اور تب ہی اٹھا جب بہن کے جہیز کا تمام فرنیچر بنا چکا تھا۔

اس کا باپ جس ورکشاپ میں کام کرتا تھا۔ اس کی مشینری کو بھی اس نے کئی مرتبہ مرمت کیا۔

جس روز اس کے والد کا انتقال ہوا وہ گھر پر ہی تھا۔ اس کا والد حسبِ معمول مغرب کی اذان سے کچھ دیر پہلے گھر آیا۔ اس نے اپنی پگڑی اتار کر چارپائی پر رکھی۔ اس کی ماں پانی کا کٹورا بھر لائی۔ پانی پینے کے بعد وہ وضو کے لیے اٹھا، اور پھر نماز پڑھنے مسجد چلا گیا۔

واپسی پر اس نے کھانا کھایا، کچھ دیر حقہ گڑگڑایا اور پھر چارپائی پر لیٹ گیا، عشاء کی اذان ہوئی اور نماز پڑھنے مسجد چلا گیا واپسی پر چپکے سے چارپائی پر لیٹ گیا اس نے کوئی بات نہیں کی۔ اس کی ماں نے لالٹین کی لو دھیمی کر دی۔ صبح چڑیوں کے چہچہانے کے بعد دیر تک جب اس کا والد نہ اُٹھا تو اس کی ماں کو تشویش لاحق ہوئی۔ پاس آئی ہاتھ لگا کر دیکھا تو اس کا جسم یخ کورے جیسا ٹھنڈا تھا اس کی ماں نے کوئی بین نہیں کیا۔ روئی نہیں، بس چپکے سے اس کو جگا دیا۔ منہ سے کچھ نہیں بولی، اس کی آنکھوں میں ہی کچھ تھا جس کو دیکھ کر وہ ایک لمحے میں ہی معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔

اب جو گور کن کی ڈھنڈیا پڑی تو معلوم ہوا سارا خاندان دریا پار کے گاؤں اپنے عزیز کے انتقال پر کل سے گیا ہوا ہے اور واپسی کی کوئی اُمید نہیں سارا دن گزر گیا تھا۔ دو تین نوجوانوں نے قبر کھودنے کے لیے اپنی خدمات پیش بھی کیں مگر اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔

ظہر کی نماز کے بعد اس نے کدال اٹھائی اور ضروری سامان لیا اور قبرستان چلا گیا۔ اس کے لیے بالکل نیا تجربہ تھا اس نے کبھی اس سے پہلے گور کن کو قبر کھودتے ہوئے دیکھا بھی نہیں تھا قبر کا سائز بھی اس نے کچھ اپنے اندازے اور کچھ ساتھ والی قبر کو دیکھتے ہوئے خود ہی طے کیا تھا۔

دو گھنٹے کے بعد قبر بالکل تیار تھی وہ چاروں شانے چت خود پہلے اس میں لیٹ گیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی زمین پسینے میں نہائے ہوئے جسم کو بہت آرام دہ لگی۔

تھوڑی دیر یونہی لیٹنے کے بعد ایک عجیب طرح کی آسودگی کے ساتھ وہ اٹھا اور قبر

سے باہر نکلا۔ قبر اس کے اندازے سے زیادہ گہری کھد گئی تھی۔ البتہ چوڑائی اور لمبائی میں اس کا سائز مناسب تھا۔

وہ گھر پہنچا، نہا دھو کر جنازہ کے لیے تیار ہوا۔ مسجد میں اعلان ہو رہا تھا:

حضرات! نماز جنازہ کے لیے تشریف لے آئیے۔

والد کو قبر میں اتارنے کے بعد جب سارے لوگ واپس آ گئے۔ وہ آخری شخص تھا جس نے سب سے اخیر میں ایک بھرپور نظر قبرستان پر دوڑائی جہاں سینکڑوں قبروں کے نشان زمین کی سطح سے بلند ہو رہے تھے۔ ان میں ایک نشان۔ اس کے والد کی قبر کا بھی تھا۔ جو اسے باقی قبروں سے یونہی قدرے مختلف محسوس ہو رہی تھی مگر یہ محض اس کا اپنا خیال تھا۔

وہ دن اور آج کا دن۔ اس نے قبریں کھودنے کا شغل ہی اپنا لیا ہے جسے اس نے ابھی تک اپنا پیشہ نہیں بننے دیا۔ ہر قبر کی تیاری کے بعد اس کے چہرے پر ایک مختلف قسم کی طمانیت ہوتی ہے۔ وہ کتنی کتنی دیر تک قبر کے سرہانے بیٹھا اسے دیکھتا رہتا ہے اس کے کناروں کو آدھ آدھ انچ تک تراش خراش کرنے میں بھی حساب رکھتا ہے۔

لوگ اس کے پاس نہیں آتے، بلکہ جب بھی گاؤں میں کوئی انتقال کر جاتا ہے۔ وہ کچھ دیر مرنے والے کے گھر بیٹھ کر اپنے گھر آتا ہے اور ضروری سامان لے کر سیدھا قبرستان پہنچ جاتا ہے۔ اسے اس سے غرض نہیں کہ لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں یا نہیں اس نے اپنے آپ کو غیر شعوری طور پر اس شغل سے وابستہ کر لیا ہے، اسے اس کی بھی پرواہ نہیں کہ لوگ کیا کہتے ہیں وہ کہتا ہے کہ قبریں کھودنے کا کام اتنا دلچسپ ہے کہ اس کا دل بھرتا ہی نہیں اور میں اپنی جگہ مسلسل سوچ رہا ہوں کہ کہیں ہم سب اسے سمجھنے میں بہت دیر تو نہیں کر رہے۔

(۱۹، اکتوبر ۱۹۹۳ء)

☆☆☆

تکون

ٹرین کے اس ڈبے میں یوں تو بے شمار مسافر بیٹھے ہیں مگر میں اس وقت اپنے علاوہ صرف دو دوسرے مسافروں کا ذکر کروں گا۔ ہاں کہانی کے آخر میں شاید تیسرا کردار بھی شامل ہو جائے مگر یہ ضروری نہیں ہے۔

میں یہ ساری بات اس لیے بیان کر رہا ہوں تاکہ آپ کو کہانی سمجھنے میں آسانی ہو۔

میرے دائیں طرف ایک بتیس چونتیس سال کا شخص ہے اور میرے سامنے بائیس چوبیس سال کی ایک خاتون۔ لڑکی اس لیے نہیں لکھ رہا کیونکہ وہ دو بچوں کی ماں ہے۔ اور جس گھرانے سے اس کا تعلق ہے وہاں ماں کو اتنی غذا میسر نہیں ہوتی کہ وہ بچوں کی پیدائش کے بعد لڑکی ہی رہے وہ عموماً عورت بن جاتی ہے۔

ہاں تو وہ شخص اپنی گود میں چھوٹے بیٹے کو بٹھائے ہوئے ہے جبکہ اس عورت کی گود میں بڑا بیٹا بیٹھا ہوا ہے۔ دونوں میاں بیوی کی طرف میرا دھیان جانے کی دو وجوہات تھیں۔

پہلی اور اہم وجہ وہ عورت ہے جس نے بڑے بیٹے کو بڑے والہانہ انداز میں ایک بازو کے گھیرے میں لے کر اپنی گود میں بٹھایا ہوا ہے۔ اس کے سر اور شانوں پر سیاہ رنگ کی ایک چادر لپٹی ہوئی ہے جس پر ستارے ٹانکے ہوئے ہیں اور سیاہ چادر میں

صاف شفاف چہرہ بالکل روشن چاند کی طرح دمک رہا ہے۔

لڑکی کے خدوخال بالکل ویسے ہی ہیں جیسے میں آج کل اپنی بیوی کے بارے میں ایک خیالی پیکر بنائے ہوئے تھا۔ عمر کے وہ ایام یا چند ہفتے جو شادی سے پہلے کے ہوتے ہیں انسان ہر نظر آنے والے چہرے میں اپنی پسند وناپسند کے نقوش تلاش اور شناخت کرنے لگتا ہے اور کچھ۔ یہی سبب تھا کہ میں نے اس عورت کو ایک جائزہ لیتی ہوئی آنکھ سے دیکھ لیا تھا۔ مگر وہ جتنا عرصہ میرے سامنے بیٹھی رہی، میری چبھتی ہوئی تجزیاتی آنکھ اس میں کسی قسم کا ردِ عمل پیدا کرنے سے قاصر رہی۔

دوسری اہم وجہ وہ چھوٹا لڑکا تھا جو باپ کی گود میں بیٹھا تھا اور وہ تمام تر توجہ ملنے کے باوجود بہت بے چین اور مسلسل عجیب وغریب حرکتیں کر رہا تھا۔ ان میں قابلِ ذکر حرکت یہ تھی کہ وہ تھوڑی دیر کے بعد دونوں ہاتھوں سے بڑے بھائی کو پیٹنے لگتا جو ماں کی گود میں بیٹھا ہوا تھا۔ بڑا بھائی جو کہ عمر میں یہی کوئی سال بڑا ہوگا۔ اس پر کسی قسم کا کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ماں باپ چھوٹے بیٹے کو سمجھاتے، منع کرتے، مگر وہ الٹا بڑے بیٹے کو دلاسا دے رہے تھے۔

چھوٹا بھائی پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑے بھائی کے منہ پر اچانک تھپڑ مار دیتا، اس کے گال کھینچنے لگتا یہ عجیب قسم کی حرکت مجھ سے دو چار بار سے زیادہ برداشت نہ ہوئی۔ اور پھر جب اس نے ایسا کیا تو میں نے بالکل اچانک ہاتھ آگے بڑھا کر چھوٹے بچے کو اس حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کی، اور پیار سے پچکارتے ہوئے کہا: "بھائی کو نہیں مارتے، پیار کرتے ہیں۔"

چھوٹے بیٹے نے تو اس پر کوئی ردِ عمل ظاہر نہ کیا، البتہ اس کے والد نے کچھ ناخوشگوار انداز سے میری جانب دیکھا اور اپنے جسم کو ایک زاویے سے گھماتے ہوئے اپنا رخ دوسری جانب کر لیا۔

بڑی عجیب بات تھی۔ بچوں کو پیار کریں تو عام طور پر والدین بہت دوستانہ

انداز سے دیکھتے ہیں اور ان کی آنکھوں میں تشکر سا جھلک جاتا ہے۔ مگر یہاں معاملہ ہی الٹ تھا۔

میں نے بچوں کو قدرے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ چھوٹا بیٹا تو ہو بہو باپ کی کاپی ہے البتہ بڑا بیٹا اپنے خدوخال کے اعتبار سے نہ تو ماں سے مشابہت رکھتا تھا اور نہ ہی والد کا عکس اس میں لہراتا تھا۔ میں نے ماں کی طرف دیکھا اس کا قد مناسب تھا۔ البتہ اس کی صراحی دار گردن اسے قدرے لمبا بنا رہی تھی ناک کوئی ایسی نوک دار تو نہیں تھی مگر پھر بھی چہرے پر بہت نمایاں تھی بالوں کو جیسے ہاتھ سے کنگھی کر کے ربن میں باندھ دیا گیا ہو اور ہونٹ اپنی ساخت اور رنگت ہر دو اعتبار سے بہت جاذب نظر تھے ان کا رنگ زیادہ دودھ اور پتی ڈال کر پکائی ہوئی چائے کی طرح تھا۔ اور جہاں یہ رنگ ختم ہوتا تھا ایک قدرے محسوس ہونے والی گہرے رنگ کی لائن سی بنتی تھی۔ یوں سمجھئے کہ بغیر لپ اسٹک کے ایسے ڈیفائنڈ (Defined) ہونٹ میں نے اس قبل نہیں دیکھے تھے۔

ہاں تو میں نے جب بچے کے گالوں کو پیار سے چھوتے ہوئے اسے اس حرکت سے باز رکھنے کی دوسری بار کوشش کی تو بچے کو مجھ سے قدرے دور کرتے ہوئے وہ شخص کہنے لگا۔ ''میں خوب جانتا ہوں آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ ایک بات ذہن میں رکھیے اب کی بار ایسا نہیں ہوگا۔'' وہ شخص تو بالکل لڑائی کے لہجے میں بولا میرے لیے اس کا لہجہ اور جملہ دونوں ہی حیران کن تھے عجیب سے گھبرائے ہوئے انداز میں میں نے اس سے پوچھا ''تم کیا جانتے ہو؟ اور اب کی بار کیسا نہیں ہوگا؟

وہ شخص بے دھڑک بولا: ''بالکل آپ کی طرح ہی پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا۔ ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی ٹرین میں ہی ملا تھا۔ یونہی بات شروع ہوئی تھی۔ ہم اُترے اور وہ بھی اسٹیشن پر ہی اُتر گیا۔ ساتھ ساتھ چلنے لگا کہنے لگا تھوڑی دیر آرام کروں گا بہت لمبا سفر کرنا ہے تھوڑی دیر رک کر تازہ دم ہو کر چلا جاؤں گا۔

اچھا تو پھر---- میں نے اس انداز سے پوچھا کہ جلدی جلدی ساری بات بتا ڈالے۔

پھر کیا---؟ وہ تو چلا گیا مگر چند مہینے بعد جب میرے گھر بیٹا پیدا ہوا تو پہلے تو میں خوشی سے پاگل تھا میں نے غور نہ کیا۔ چند مہینے بعد ایک روز اچانک ہی مجھے اپنے بیٹے کو دیکھ کر وہ شخص یاد آ گیا جوں جوں میرا بیٹا بڑا ہوتا گیا۔ اس کے نقوش اس شخص کے خدوخال میں ڈھلتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ اور بعد میں تو لوگوں نے منہ پر کہنا شروع کر دیا کہ نہ تو ماں پر ہے اور نہ ہی باپ کی مشابہت ہے۔ عجیب عجیب انداز سے لوگ باتیں کرتے تھے سامنے والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی وہ عورت جو اس کی بیوی تھی اور بڑے بیٹے کو والہانہ انداز میں ایک بازو کے گھیرے میں لیے بیٹھی تھی، مجھے تھوڑی دیر کے لیے کوئی اپسرا لگی۔ اس کا چہرہ بالکل بے تاثر تھا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ میرے لیے یہ بات بہت دلچسپی کا باعث تھی۔

اس شخص کی سوچ عجیب جاہلانہ اور بے سروپا تھی اور میں ایک لمحے کے لیے اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔

باقی سفر جتنا بھی کٹا میں چوروں کی طرح دبکا چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اس تمام عرصے میں اس شخص نے چھوٹے بیٹے کو اپنی گود میں ہی رکھا۔ اور راستے میں مختلف طرح کی چیزیں لے کر دیتا رہا۔ کبھی ٹافیاں کبھی آئس کریم اور کبھی بوتل۔ مگر بڑے بیٹے کو جو ماں کی گود میں دبکا پڑا تھا۔ ایک آدھ بار ہلکے سے پوچھا، جس پر اس نے انکار کر دیا۔

وہ عورت کہ جسے میں لڑکی نہیں کہہ سکتا تھا تمام راستے گردوپیش سے بے نیاز اور بے تاثر چہرے کے ساتھ بیٹھی رہی۔ اس نے اپنے خاوند کی کوئی بات سنی یا نہیں، معلوم نہیں۔ دیکھنے میں وہ قدرے پڑھی لکھی اور بہتر لگ رہی تھی جب کہ اس کا خاوند شاید اخبار پڑھ سکتا ہو۔ ہو سکتا ہے اخبار بھی نہ پڑھ سکتا ہو اور صرف دستخط کر سکتا ہو گا، اور شاید دستخط بھی نہ کر سکتا ہو گا۔ ایسے شخص کا کیا خواب ہو گا جس کی تعبیر وہ بچوں میں تلاش کرے گا۔

ہاں مگر اس لڑکی کا خواب ہو سکتا ہے جسے وہ اپنی اولاد میں ہی تلاش کر سکتی ہے وہ لڑکی جو کہ بائیس چوبیس سال کی عمر میں ایک مکمل عورت بن گئی تھی اس کا آئیڈیل اس کے بیٹے کی شکل میں جب جوان ہوگا تو کیا تمام عمر محض خوابوں کے سہارے گزارنے والی چند خواب اپنے بیٹے کو منتقل کر سکے گی اور اس شخص کا آئیڈیل جب چھوٹے بچے کی صورت میں نشوونما پائے گا، پروان چڑھے گا تو کیا ایک ہی گھر میں پیدا ہو کر پروان چڑھنے والے بچے اپنے درمیان بھائیوں کا سا تعلق قائم کر سکیں گے۔

یہ عورت جو اس وقت میرے سامنے بے تاثر و بے زبان بیٹھی ہے اس کے اظہار کی یہ خوفناک شکل کس انجام کو پہنچے گی؟ یہ سفر کب ختم ہوگا؟ کوئی اسٹیشن بھی نہیں آ رہا تھا کہ میں اپنی منزل سے پہلے ہی اُتر جاتا۔ اور ان نظر والے غیر انسانی وجودوں سے خود کو دور کر لیتا مگر گاڑی چلتی جا رہی تھی چلتی جا رہی تھی۔

یہاں سے کہانی میں تیسرا کردار داخل ہوتا ہے اور وہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت ہے جو سامنے والی سیٹ پر اس لڑکی نما عورت کے بائیں طرف بیٹھی تھی۔ اس ادھیڑ عمر عورت کا شاید میں نوٹس بھی نہ لیتا۔ مگر جب ٹکٹ چیکر نے آ کر ان سے ٹکٹ مانگے تو اس ادھیڑ عمر عورت نے اپنے پرس میں سے تین ٹکٹ نکال کر دکھائے۔

یہ ادھیڑ عمر عورت اپنے خدوخال کے اعتبار سے نہ تو لڑکی کی ماں لگتی تھی اور نہ ہی لڑکا اس کا بیٹا لگتا تھا۔ تو پھر اس عورت کا ان دونوں کے ساتھ کیا تعلق بنتا ہے؟ انسانی رشتوں کے باہمی تعلق کو خدوخال کی مناسبت سے تلاش کرنے میں کیا آپ میری مدد کر سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو مجھے کچھ وقت دیجیے۔ تاکہ گاڑی آہستہ ہونے پر میں رشتوں کی اس تکون سے باہر نکل جاؤں مگر گاڑی ہے کہ چلتی جا رہی ہے چلتی جا رہی ہے۔

(نومبر ۱۹۹۴ء)

☆☆☆